چغتائی کے افسانے

حصّہ دوم

مرزا عظیم بیگ چغتائی

تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور

چغتائی کے افسانے

حصّہ دوم

مرزا عظیم بیگ چغتائی

ناشران

تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور

اتحاد پریس بل روڈ لاہور میں چھپوا کر شائع کیا۔

مزاحیہ ڈرامے

طنزیات

نمبر شمار	مضمون	نمبر صفحہ

ادبیات

فکاہات و مزاحیات

خود مختار دوشیزہ

انگلستان کی ایک جھلک

"یہ کیا ہے ؟" میں نے دوسرا گلاس ختم کرتے ہوئے پوچھا" بولتی نہیں یہ کیا ہے۔۔۔۔۔؟"

اس کے سُرخ ہونٹ دہکنے لگے، سارا چہرہ شرارت کے نور سے تلملا اُٹھا صاف وشفاف چہرے پر سُرخی جھلکنے لگی چہرہ مسرت آمیز جذبات کا آئینہ تھا۔ اس نے اپنے سُرخی مائل سنہری بالوں کی خوبصورت اور پیچ در پیچ لٹ کو کان کے پاس کرتے ہوئے ساحرانہ انداز سے کہا۔ مسکراہٹ کو روکتے ہوئے، آنکھوں کو جھپکاتے ہوئے، اپنا سر میرے بالکل ہی قریب لاکر سر سے سر ملاتے ہوئے رازدارانہ۔ ساحرانہ۔ مکّارانہ لہجہ میں، کپکپاتی ہوئی آواز سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، میرا بازو دباتے ہوئے اور خالی گلاس کو ایک انداز سے میری آنکھوں کے سامنے نچاتے ہوئے:۔

"ہے نہیں ...... پیارے احمق ...... ہے نہیں بلکہ تھا" گلاس اُلٹا کر کے رکھ دیا۔

اور واقعہ یہ ہے کہ گلاس خالی تھا۔ اس میں اس وقت کچھ بھی نہ تھا۔

میں نے کہا:۔

"کیا تھا.....؟"

جیز[1] کا نغمہ! خدا کی پناہ۔ قلب اور خون کو حرکت دینے والا۔ بیٹھے بٹھائے اس کی بنی تُلی گت پر رگ رگ پھڑکتی ہے۔ ہم بال روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے پری وشوں کا مجمع ہر ایک اپنے محبوب کے ساتھ حرکت میں تھا۔ پوئٹری آف موشن[2] "(Poetry of motion) جس کو ہمارے یہاں ناچ یا رقص کی ذلیل اصطلاح سے یاد کرتے ہیں! نہیں جانتے کہ جب وقت حرکات و سکنات نظامِ شعری کے ماتحت فنِ عروض و قوافی کی پابندی کے ساتھ راگنی کا ساتھ دیتے ہیں تو نتیجہ کس قدر شیریں اور ہوش رُبا ہوتا ہے!

میرے سوال کا جواب اُس نے یہ دیا کہ "جیز" کے دل ربا ترنم کے ساتھ ساتھ وہ گانے لگی۔ اس قدر آہستہ کہ سوائے ایک ہلکے ترنم کے میں بھی کچھ نہ سُن سکا۔ ایک ہلکی سی جھنجناہٹ تھی۔ مسکراہٹ سے چہرہ دمک رہا تھا۔ آنکھوں میں غضب کی چمک۔ راگنی اور شراب میں کوئی بچہ نہ تھا۔ یہ کمبخت ایک قسم کی ہلکی شراب

---

[1] رقص کا خاص باجہ یا بینڈ [2] نظم الحرکات" یا بالفاظ دیگر حرکتیں جو مل کر نظم بنائیں۔

تھی۔ جس کا دوسرا گلاس میں ختم کر چکا تھا۔ میں یہ بھی نہ جانتا تھا کہ یہ شراب ہے مگر نہیں غلط۔ شراب خود کہہ دیتی ہے کہ میں شراب ہوں۔ پہلے گلاس تک تو مجھے کہنے کو شبہ تھا۔ دوسرے گلاس پر یقین مگر تجاہل عارفانہ سے کام لینا پڑا، وہ جانتی تھی کہ میں نے کبھی شراب نہیں پی اور نہ کبھی پیوں گا۔

× . × . × . × . × . × . ×

بہت جلد بال روم کا سین ایک رنگین و متزلزل خواب معلوم ہونے لگا۔ میرے حسین ہمدم کی خوبصورت تصویر آنکھوں کے ذریعہ دل میں گھستی معلوم ہوئی میرے ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھا۔ وہ میرے سر سے سر جوڑے گویا میری آنکھوں میں غوطہ کھائے بیٹھی تھی عطر سے مہک رہی تھی۔ اس کی گرم گرم سانس میرے لئے کیا تھی! عجیب دلکش سماں تھا۔ سارا بال روم حسن اور نغمہ کے زور سے بھڑک رہا تھا! چشم زدن میں نغموں کی شیریں فضا میں بال روم جھومتا معلوم ہوا بلور کا سامان آرائش اور جھاڑ فانوس جھوم رہے تھے۔ پیانو سے نغمہ کی دلدوز برچھیاں نکلنے لگیں۔ ساز کے پردوں سے آتشین لپٹ نکلتی معلوم ہوئی میں نے اپنے دل نشین دوست کو دیکھا۔ اس کی خوبصورت اور نشیلی آنکھوں میں سرور تھا اور میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ جوانی .... رعنائی! ..... چہرہ پر اس کے خفیف مسکراہٹ کی لرزش تھی اور نوجوان سینہ نغمہ کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ دب دب کر ابھر رہا تھا۔

اہ! میں نے کہا "پیارے دوست۔ تم کس قدر دلچسپ ہو۔"

اُس نے مسکرا کر کہا "واقعی!"

میں نے کہا "میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔"

میرا یہ کہنا تھا کہ گویا وہ مجھے جھپٹ لے گئی ایک دم سے۔ میری کمر میں ہاتھ ڈالا "جینز" کی گت پر از خود ہم دونوں گویا ایک دوسرے کے آغوش میں.......

آہا آہا!...... لرزتے ہوئے! تلملاتے! اُچھلتے ہوئے گنگناتے چلے۔ گٹار کے نغمہ پہ........ بنجو کے تاروں پہ........ لرزش سے جھنجھناتے چلے........ تھرکتے ہوئے........ ساز کی خامشی میں سمٹتے ہوئے ......! بین کی دھونکنی سے اُبھرتے........ جھناجھن پر پنجہ جھٹکتے ......"رفاردت" پر سر کو پٹختے ہوئے........ کشاکش میں کاندھے رگڑتے ہوئے...... کپڑوں کی جھم جھم!...... چہروں کی چم چم....... دمکتے ہوئے...... چمکتے ہوئے........ نور کی چھوٹوں سے چھپکتے چلے.....! متحرک!...... متزلزل...... لرزاں! رقصاں! افتاں! خیزاں! ساز کے ساتھ گٹکریاں کھاتے۔ گرہ لگاتے۔ زندہ دلوں کے متزلزل و متلاطم سمندر کے ہوشربا زیر و بم میں گم ہو گئے........ اللہ رے بیخودی! الامان! خدا محفوظ رکھے! خون میں حرکت! جی میں حرکت! دل میں حرکت! دماغ میں حرکت! خیال میں حرکت! خود مجسم حرکت۔ رقص نہیں بلکہ حرکت کا خون تھا "جینز"

کا قوی اور مضبوط دل نغمہ کی طاقتور شہ رگ کے ذریعہ ہر دھڑکن کے ساتھ پھینک رہا تھا جو موجیں سی مارتا ہر شخص کو حرکت دیتا تھا۔ اسی دھڑکن سے ایک جنبشِ پیہم تھی، جنبش نغمہ! حرکت! رقص! رقص! سارا بال روم مع ہمارے جھوم رہا تھا! اور یہ حرکت کس قدر پر کیف کس قدر شیریں۔ کس قدر دل ربا۔ اور دلکش تھی! . . . . . کیا کہنا ہے! مشرق میں اُلّو بولتا ہے، مغرب میں کیا ہے: ہندیوں سے یعنی ہم سے پوچھیئے نہیں بلکہ کسی مولوی سے سہی کہ سجدہ کدھر مُنہ کر کے کریں . . . . . مغرب!

——————— :: ۲ :: ———————
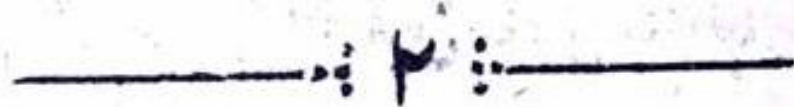
انگلستان کی جما دینے والی سردی تھی۔ غلیظ کہرا اور ابر۔ کوئی بھلا مانس باہر نہیں نکل سکتا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ میں آتشدان کے سامنے بیٹھا صاحب خانہ کی دلچسپ لڑکی سے باتیں کر رہا تھا۔ باتیں۔

معلوم ہُوا کہ کوئی صاحب باہر مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ اندر نہیں آتے۔ بس کھڑے کھڑے مل لیں گے۔ میں نے کہا کون ہے تو معلوم ہُوا۔ "کوئی بڈھا خبطی" میری زبان سے نکلا۔ "بڈھا" اور میں اُٹھا۔

کوئی ساٹھ برس یا حد پینسٹھ کی عمر ہو گی کھٹی رنگ کا سوٹ پہنے۔ ایک طوفان زدہ نائٹ کیپ۔ چہرہ سرخ مگر ناک اور بھی سرخ۔ انگارہ۔ مونچھیں سفید مگر پائپ کے تمباکو کے دھوئیں نے بھورا کر دیا تھا۔ پتلون ٹانگوں سے

مع مبالغہ ڈیڑھ گز بڑا۔ جس کی وجہ سے معلوم ہو کہ اس شخص کی ہر ٹانگ میں کئی گھٹنے ہیں نہ سہی یہ تو کم از کم گھٹنے کا محل وقوع تو معلوم کرنے میں قطعی دشواری ہو۔ آنکھیں نیلی۔ چہرہ باوجود بڑھاپے کے خوبصورت ناک و نقشہ بھی پاکیزہ کشیدہ قامت۔ چہرہ بتادے کہ گٹھیا کا مریض۔

نہایت ہی رکھائی سے بات چیت ہوئی۔ بڑے میاں نے میرے نام کی مجھ سے تصدیق چاہی اور میں نے اثبات میں جواب دیا تو ذرا چہرہ کو سنجیدہ بنا کر انہوں نے انتہائی "اِنگلش" سادگی سے کہا جو کچھ کہا میں اس کا ترجمہ پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں ورنہ اصل لطف تو انگریزی ہی میں ممکن تھا، خیر وہ بولے:۔

"لُک ہیر بوائے"[1] "تمہاری لڑکی" (محبوبہ) کون ہے؟ کیا میں اس کا نام معلوم کرسکتا ہوں"؟

میں حقیقت کی تہہ کو پہنچ گیا۔ میں نے کہا۔ جناب من۔ معاف کیجئیگا میری کوئی محبوبہ نہیں۔ ہاں میری دوست ملنے والیاں کئی خوبصورت لڑکیاں ہیں"۔

"اُن میں کوئی خاص بھی ہے"؟

میں نے مکاری سے کہا: "سب خاص ہیں"۔

---

[1] اے نوجوان ادھر دیکھو مخاطب کرنے کا محاورہ ہے۔

اولڈ بوائے!" بڑے میاں جھلا کر بولے۔ "میں بھی کبھی تمہاری طرح نوجوان تھا اور . . . .

اور . . . . مکّار بھی۔ تمہاری ملنے والیوں میں کوئی سب سے زیادہ خوبصورت بھی ہوگی"

میں نے عیاری سے کہا" کوئی کسی کو خوبصورت خیال کرتا ہے۔ اور کوئی کسی کو یہ تو اپنی اپنی نظر ہے"

بڑے میاں جھلا کر بولے:۔

میں اِدھر اُدھر جھاڑیاں خالی نہیں جھاڑتا۔ سُن لو کان کھول کر۔ میں ایکلی کا باپ ہوں . . . ."

بات کاٹ کر میں نے تصنع سے کہا" اوہو! آپ میری پیاری دوست کے باپ مسٹر آئیٹ ہیں میں بیحد خوش ہوُا۔ جناب کی خدمت میں نیاز . . ."

بڑے میاں خفا ہو کر بولے "تم . . . . . تم اس کے ساتھ ساتھ گھومے شبستانوں میں . . . . . . رات گئے تک"

"معاف کیجئے گا۔ معاف کیجئے گا" میں نے کہا" جی۔ جی۔ وہ میرے ساتھ ساتھ گھومتی ہیں۔ یہی مطلب ہے جناب کا نا . . . . . ؟"

تُم اُسے جگہ جگہ لے جاتے ہو"

میں نے کہا" غالباً وہ مجھے جگہ جگہ لے جاتی ہیں۔ میں انہیں نہیں

لے جاتا۔ یہ آپ نے کیسے فرمایا؟ میں ان کے ساتھ پھرتا ہوں یا وہ؟ وہ مجھے لے جاتی ہیں یا میں؟"

بڑے میاں بولے "خیر بات ایک ہی ہے تو مطلب میرا یہ ہے کہ میں یہ ہرگز نہیں پسند کرتا کہ میری لڑکی بغیر میری اجازت کے اجنبی لڑکوں کے ساتھ اس آزادی سے رات گئے تک گھومتی رہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ تم سے ملے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اُسے جگہ جگہ لئے پھرو۔ ابھی مجھے کل ہی معلوم ہُوا کہ ایک رقص کے جلسہ میں وہ ضرورت سے زیادہ آزادی کے ساتھ تمہارے گلے میں باہیں ڈالے کھڑی تھی .... یہ ناقابل برداشت ہے"

میں نے کہا "جنابِ من۔ میں آپ کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں آپ اگر اپنی صاحب زادی کو روکنا چاہتے ہیں تو بہتر ہے کہ آپ خود انہی سے کہئیے۔ غالباً آپ کا حق ان پر زائد ہے۔ وہ آپ کے احکام کی پابند ہوں۔ معاف کیجئے میرے اوپر آپ کی حکم برداری لازمی نہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ وہ مجھ سے نہ ملیں اور اپنے ساتھ مجھے جگہ جگہ نہ لئے پھریں مجھے افسوس ہے کہ آپ تجربہ کار ہو کر مجھے دبانا چاہتے ہیں خود آپ کی لڑکی جب نہیں مانتی تو میں کیوں کر آپ کے احکام کی تعمیل پر مجبور کیا جا سکتا ہوں!"

بڑے میاں جل کر بولے:" مگر تم اس کے ساتھ یہ حرکتیں جاری نہیں رکھ سکتے۔ تم میری بھولی بھالی لڑکی کو آوارہ کر دو گے!"

میں نے جل کر کہا:" قبلۂ من۔ میں کالا ہوں کہ وہ؟ میں خوبصورت ہوں کہ وہ؟ میں ان کو بگاڑ سکتا ہوں یا وہ مجھے؟ مجھے وہ احمق بنا سکتی ہیں یا میں ان کو؟ میں بھولا اور معصوم ہوں یا وہ؟ میں قابل الزام ہوں یا وہ.....؟ دیکھئے اور انصاف کیجئے......"

یہ کہہ کر میں نے اپنے چچا صاحب قبلہ کا خط ان بڑے میاں کے ہاتھ میں دیا۔ شفیق چچا۔ جن کی صاحب زادی کے دست حق پرست پر مجھ کو ابھی ایمان لانا باقی تھا۔ یہ خط انگریزی میں تھا۔ اس میں کیا لکھا ہوگا! اپنے ہونے والے داماد کو ایک شخص کیا لکھ سکتا ہے جبکہ داماد ولایت میں ہو اگر ان انگریز بڑے میاں کی حسین و دلربا صاحب زادی بھولی بھالی اور معصوم تھیں تو یہ خاکسار اپنے شفیق چچا کی نظروں میں معصوم تر تھا۔ چچا صاحب قبلہ کو بیحد اندیشہ تھا کہ کہیں یہ نازنینانِ فرنگ مجھ بھولے بھالے اور معصوم نوجوان کو آوارہ نہ بنا دیں۔ ان کی چالاکیاں عیاریاں۔ فریب کاریاں ایسی ہیں کہ میرا بچنا دشوار ہے۔ جس طرح یہ بڑے میاں نہیں چاہتے تھے کہ میں انکی بھولی بھالی لڑکی کو لئے پھروں اسی طرح قبلہ چچا صاحب نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بھتیجے یعنی خاکسار کو ایملی سی کوئی ولایتی لڑکی لئے پھرے۔ ان کا خیال تھا

کہ یہ مغربی تیتریاں مجھے آوارہ کردینگی لہٰذا مجھے اِن سے بچنا چاہیئے۔

اس بڈھے انگریز نے سب کا سب خط غور سے پڑھا۔ پائپ مُنہ سے نکال کر کرسی پر پیر رکھتے ہُوئے بولا۔" آہم ...... م ...... م ......"

بھویں چڑھائیں۔" مجھ سے پوچھا۔ یہ کون ہیں ؟"

میں نے جواب دیا۔"یہ میرے چچا ہیں۔"

" تو کیا یہ سب یورپین لڑکیوں کو ایسا ہی سمجھتے ہیں ؟"

" میں کیا جانوں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

" مگر کیا یہ بہتر نہیں کہ تم ایملی سے اب نہ ملو۔ اب تو اور بھی نہ ملو۔"

میں نے کہا۔" ...... بالفاظ دیگر وہ مجھ سے نہ ملیں ! ...... جی ہاں ٹھیک ہے بہتر ہے کہ وہ مجھ سے اب تو اور بھی نہ ملیں۔ تو آپ ان کو بتاکید کہہ دیں کہ وہ مجھ سے نہ ملیں اور نہ مجھے جگہ بہ جگہ لئے پھریں۔ ورنہ آپ کا کیا خیال ہے ...... بالفرض میرے چچا آپ کی پیاری صاحبزادی کو لکھیں ! ...... رہ گیا میں۔ تو آپ جانتے ہیں کہ وہ میری عزیز ترین دوست ہیں۔ میرا ان کا یہ رشتہ نہیں کہ میں اُن سے کہوں کہ ......

بات کاٹ کر وہ بولے :۔

" تم ہندوستانی لوگ ......"

میں خاموش رہا۔

وہ بولے:" ہم لوگ ہندوستانیوں کو قطعی پسند نہیں کرتے "
میں نے کہا:" اجی قبلہ کب سے ؟ . . . . بالکل ؟"
وہ بولے " ہم واقعی ہندوستانیوں کو پسند نہیں کرتے "
" اور ہندوستان کو ؟"
" ہندوستان بھی ناپسند ہے "
" اور پھر ہماری چھاتی پر سوار ہو۔ جان چھوڑنا ہماری . . . . . . "
بات کاٹ کر وہ بولے:" کتنے ہندوستانی ہماری لڑکیوں سے میل رکھتے ہیں اور محبت کرتے ہیں اور پھر کتنے ان میں سے شادی کی نیت رکھتے ہیں اور پھر کتنے ان میں سے شادی کرتے ہیں۔ شاید دس فی صدی بھی ہماری لڑکیوں سے شادی نہیں کرتے۔ ارادہ ہی شادی کا نہیں رکھتے۔ پھر ایسی صورت میں ہماری لڑکیوں سے کیوں ملتے ہیں اور پھر وہ بھی کیسے ؟ جیسے تم میری ایملی سے ملتے ہو . . . . . . سخت قابل اعتراض . . . . . قابل نفرت . . . . . ناقابل برداشت . . . . . . کان کھول کر سن لو۔ یہ صورت حال جاری نہ رہنا چاہیئے۔ میں سب سن چکا۔ بہتر ہے کہ آئندہ تم ایملی کے ساتھ نہ نظر پڑو . . "
" . . . . . بالفاظ دیگر وہ میرے ساتھ نظر نہ پڑیں۔ قطعی . . . . ٹھیک . . . . . . اس کا مناسب انتظام فرمائیں "
" مائی لیڈ[1] . . . . . . " برہم ہو کر بڈھے نے کہا " تم جوان ہو۔ اور

---

[1] میرے نوجوان !

میں بوڑھا ہوں ورنہ ابھی تمکو معلوم ہوجاتا کہ راستی کیا ہوتی ہے۔ تم جذبات کا خیال نہیں کرتے۔ ایک بھولی بھالی لڑکی کو خراب کرنے کے درپے ہو.....“

میں نے بُرا مان کر کہا۔”غالباً اس قسم کے الفاظ میں سننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ قابل احترام بزرگ۔ آپ بچہ نہیں ہیں۔ نہ آپ کی بچّی بچّہ ہے۔ وہ تعلیمیافتہ ہے پڑھی لکھی ہے۔ آزاد ہے۔ خود مختار ہے۔ اپنا بُرا بھلا خود بہتر جانتی ہے۔ آپ نے اس کو سمجھایا اچھا کیا۔ نہیں مانتی ؟ وہ خود جانے آپ کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ آپ کی صاحبزادی صاحبہ ماشاء اللہ نہ صرف نوجوان اور خوبصورت ہیں بلکہ نہایت ہی سمجھدار۔ ہوشیار، عقلمند اور صائب الرائے ہیں۔ احمق نہیں ہیں۔ اور اگر ہیں تو نہ میرے بس کی بات نہ آپ کے۔ یہ بھی آپ کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ میرے اوپر آپ کا زور نہیں چل سکتا۔ میں اپنے فعل کا خود مختار ہوں۔ آپ کو کوئی حق نہیں کہ مجھ سے ایسی باتیں کریں۔ اس سے کہیں بہتر ہے کہ براہ کرم جائیے اور معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے۔“

بڈھے میاں کی حالت یہ سُن کر غیر ہوگئی۔ بے بسی نے غصّہ کو دبانے پر مجبور کیا۔ ہونٹ چبا کر رہ گئے۔ تاؤ کھا کر رہ گئے۔ گھٹ کر رہ گئے۔ کہنے لگے ”والٹر آئے گا تب وہ تم سے ہندوستانی طریقہ پر معاملہ فہمی کریگا اور جب ہی تم راہ راست پر آؤ گے۔“

میں نے کہا: "خوش آمدید۔ خوش آمدید مسٹر دالٹر کو خوش آمدید۔ میں ہمیشہ معاملہ فہمی کے لئے تیار رہوں"۔

"غالباً تم اس تکلیف دہی کا خیال نہ کرو گے"۔

"اوہ!" میں نے معذرت کو قبول کرتے ہوئے کہا۔ "ہرگز نہیں..... ہرگز نہیں......."

"خدا حافظ......."

"خدا حافظ......."

مجھے غالباً اس انگریز بڈھے سے ہمدردی تھی۔ ایک گونہ تکلف کے ساتھ اپنی کرخت اور گھٹیا دی ٹانگوں سے "وہسکی" کے نشہ میں پینگ سے لیتا ہُوا چلا جا رہا تھا دھواں چھوڑتا۔ پائپ کُریدتا ہُوا۔ میں اس کو دیکھتا رہا حتیٰ کہ وہ سڑک پر کہرے کے دُھند میں غائب ہو گیا۔

۳

اس واقعہ کے کوئی دو ہفتہ بعد کا ذکر ہے کہ ایملی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے میں پارک کی طرف جا رہا تھا۔ ایک دم سے ہمارا راستہ ایک تنومند نوجوان نے سامنے سے روک لیا۔ ایملی ایک دم سے ذرا پیچھے ہو گئی۔ یہ شخص نہایت ہی وجیہ۔ متناسب الاعضا۔ دھاریدار وضعدار سوٹ پہنے ذرہ ترچھی ٹوپی لگائے۔ اپنی کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکی کی طرف اُنگلی اُٹھا کر مجھ

سے بولا:۔

"تم جانتے ہو یہ تمہاری ساتھی لڑکی کون ہے؟..... تم جانتے ہو کہ یہ تمہارے ساتھ کون احمق لڑکی ہے؟..... (رک کر) میری بہن ہے"

میں نے کہا۔" تو پھر میں کیا کروں؟"

"میں کیا کروں؟......! کیا میں بتاؤں کہ تمہیں کیا کرنا چاہیئے؟"

"بہتر ہے" میں نے کہا "گو میں خود جانتا ہوں" (میں نے طنزیہ لہجہ میں کہا) "مگر ہاں آپ بتائیں اور ضرور بتائیں"!

"تم اس وقت اسے کہاں لئے جاتے ہو؟" وہ چیخ کر بولے۔

میں نے کہا "یا بالفاظ دیگر یہ مجھے اس وقت کہاں لئے جا رہی ہیں؟.... شاید یہ خود بتا سکیں"!

"یہ فرض آپ کا ہے نہ کہ اس احمق لڑکی کا" وہ ذرا زور دے کر بولے

میں نے کہا "جناب من! مجھے اپنے تمام فرائض کا نہ صرف علم بلکہ احساس بھی ہے۔ اور غالباً ان فرائض کی سبکدوشی کے بار گراں سے آپ کے کندھوں کو دور کا بھی واسطہ نہیں ہے...... مطلب یہ کہ ہونا نہیں چاہیئے تھا۔ ویسے آپ کی مرضی۔ مگر غالباً ہم دونوں اس موقعہ پر کوئی عملی "بدمزگی" کے خوشگوار امکان پر غور کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں"

"مگر آپ پر واضح ہو جانا چاہیئے کہ یہ بے وقوف لڑکی میری چھوٹی

بہن ہے۔"

میں نے کہا" واضح ہو گیا۔"

" اچھا۔ تو پھر میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم اسے روز کیوں لئے پھرتے ہو؟"

" پھر وہی"! میں نے کہا" بالفاظ دیگر یہ مجھے روز کیوں لئے پھرتی ہیں؟ شاید کہ یہ خود بتا سکیں۔"

وہ بولے" اچھا یوں ہی سہی تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے ہندوستانیوں سے نفرت ہے۔" (منہ بگاڑ کر)۔

میں نے کہا" میں دوستانہ مشورہ دیتا ہوں کہ آئندہ آپ قابل نفرت ہندوستانیوں سے بات بھی نہ کریں بلکہ اسی دم اس پر عمل درآمد کریں۔ کیا آپ ایسا نہ کریں گے؟"

وہ تیز ہو کر بولے" لک ہیر (اِدھر دیکھو) میں اس قسم کی گفتگو کا عادی نہیں ہوں۔ بس خیریت اسی میں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ راستہ ہے واپسی کا (انگلی اٹھا کر) سیدھے۔ تیر کی طرح بھاگ جاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کوئک مارچ! بھاگو۔۔۔"

اس کی غصہ سے آنکھیں لال ہو گئیں۔ نوجوان انگریز سخت غضبناک تھا۔ مگر خوش قسمتی سے انگریز جتنا مضبوط اور توانا ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے" دھکی" بھی پئے رہتا ہے۔ یہ انگریز بھی تھے اور مضبوط بھی۔ پھر میں

بھی مٹی کا بنا ہوا نہیں تھا۔ مگر حق اُس کی طرف تھا۔ میں حتی الوسع دبنا ہی چاہتا تھا۔ لہٰذا میں نے یہ بدمستی ان کی برداشت کی اور کہا:۔

"مائی لارڈ۔ آپ کا زورِ بیان سر آنکھوں پر۔ مگر کیا میں عرض نہیں کرسکتا کہ ان الفاظ کو آپ واپس لیں۔ بجائے مجھے حُکم دینے کے بہتر ہے کہ آپ اپنی دلچسپ اور شیریں بہن کو حُکم دیں کہ وہ آپ کے ساتھ چلی جائیں یہ سیدھا راستہ ہے ...."

(میں نے اُنگلی اُٹھا کر کہا) میں یہیں کھڑا رہنا۔ تنہا کھڑا رہنا۔ زیادہ پسند کرونگا۔ آپ جائیں دونوں بھائی بہن، کوئیک مارچ ...."

یہ بات ان کے انگریزی دماغ میں آگئی اور فوراً بہن سے بولے:۔

"کم آن ایملی"

بہن صاحبہ خاموش رہیں۔ مگر ایک قدم اور پرے ہٹ گئیں

DONT BE SILLY

"ڈونٹ بی سِلی ......" (احمق پن نہ کرو) وہ بولے۔

بہن بولی "کانٹ یو لُک ٹو یور اون افیرس" (کیا تم خود اپنے معاملات میں مشغول ہونا پسند نہ کروگے" (بہ نسبت اس کے کہ میرے معاملات میں دخل دو)

تن کر بولے "اب زیادہ احمق نہ بنو..... شمپین پی پی کر مدہوش

ہو کر حبشیوں کے ساتھ ناچنا قطعی قابل اعتراض ہے"۔

برہم ہو کر بہن بولی۔ ذرا چیخ کر:" کانٹ یو لک ٹو یور ان تھنگس لیٹ می الون"۔ (مجھے چھوڑ دو اور اپنے معاملات دیکھو)

بہن سے شکست کھا کر اب بھائی صاحب بہادر میری طرف پھر متوجہ ہوئے۔ بولے" غالباً اب تم کچھ ٹھوس اور مادی چیز پسند کرو گے"۔ اپنی مٹھی کا گھونسا بناتے ہوئے سر ہلا کر بولا۔

میں نے کہا" ضرور۔ مادی بھی اور غیر فانی بھی"۔

اتنا کہہ کر میں اڑنگا لگانے کے امکان کی طرف متوجہ ہوا۔ انگریز جب اپنے سے قدرے مضبوط مل جائے تو چاہیئے کہ" گھونسا بچاؤ۔ اور اڑنگا لگاؤ"۔ والے اصول پر عمل کرو۔ فتح ہوگی۔ اگر تم نے گھونسا بچا لیا تو جس طرف بھی اڑنگا لگا دوگے۔ شراب کے نشہ میں اسی طرف لوٹ جائیگا کم از کم ایک دفعہ تو ضرور ہی گر جائیگا۔ مگر میرے لئے ایک اور مصیبت تھی۔ میں ایملی کے سامنے اُس کے بھائی کو اگر مارنا نہیں چاہتا تھا تو اُس سے پٹنا تو اور بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو اور بھی خراب ہوتا۔

غضبناک انگریز نے کچکچا کر گھونسا مارا۔ ایک۔ دو۔ تین۔ پہلا خالی گیا۔ دوسرا میرے کندھے پر اوچھا سا لگا۔ تیسرا اُس کی بہن نے پکڑ لیا۔ اور وہ بھائی سے لپٹ پڑی میرے اور اپنے بھائی کے بیچ میں آگئی۔

اُس کے بھائی کا قابل اعتراض رویّہ دراصل ایک انگریز دوشیزہ کی غیور طبیعت کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ خود غور فرمائیے۔ کیا اُس کے نوجوان ملنے والوں کا یہی حشر ہونا چاہیئے۔ اگر ایسا ہی ہے۔ تو پھر انگلش سوسائٹی کا نظام ہی برہم ہو جائیگا۔ ہر عاشق شادی سے قبل دوران کورٹ شپ ہی میں پٹ جائے! یہ پروگرام تو سخت "اَن انگلش" ہوا۔ اُس نے بگڑ کر بھائی سے کہا:

"والٹر یہ ناقابل برداشت ہے۔ بس۔ خبردار جو میرے معاملات میں دخل دیا۔"

"مت بکو تم" بھائی نے پیر پٹخ کر کہا: "...... یہ کالا حبشی ......"

"پھر تم کون ؟" بہن چمک کر بولی "کیوں۔ کیا تم ایمانداری سے کہہ سکتے ہو کہ تم سے تمہاری "نیچرڑی" مگر متمول محبوبہ کے باپ نے کتنی دفعہ تاکید سے کہا ہے کہ میری لڑکی سے نہ ملو۔"

"تو پھر؟" والٹر نے کہا۔

"کیا تم نے اُس یہودی صفت ہونے والے خُسر سے یہی نہیں کہہ دیا۔ کہ منع کر لو اپنی لڑکی کو۔ اور کیا وہ مان گئی ؟ کیا وہ اب تم سے نہیں ملتی۔ کیا وہ تمہاری زوجہ نہیں بنے گی ؟ کیا تمہارا ہونے والا خُسر تُم سے نہیں ہار گیا ؟"

والٹر نے کہا: "تو پھر تمہارا کیا مطلب ہے ؟"

"مطلب میرا یہ ہے کہ تم جاؤ یہاں سے۔"

"والٹر نے کہا "تمہارے اس سیاہ فام دوست (یعنی خاکسار) کا سر کچلنے سے قبل؟"

میں نے احتجاج بلند کیا "تم اپنے بھائی کو منع کرو" باوجودیکہ اس سے بھی زیادہ توہین آمیز الفاظ سُننے کے لئے میں تیار تھا۔ لیکن میں نے ایملی سے کہا "میں اب برداشت نہیں کر سکتا۔"

والٹر نے کہا۔ میری طرف حقارت آمیز نظر ڈالتے ہوئے "میں اپنی بہن کو ایک سیاہ فام انسان کے ساتھ معاشقہ کرتے کیسے دیکھ سکتا ہوں میرے لئے تو یہ ناقابل برداشت ہے۔"

تیز ہو کر ایملی بولی "والٹر تم اپنی زبان کو روکو۔ میں ہرگز کسی سے معاشقہ نہیں کرتی۔ اور کروں تو مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں تمہاری طرح ریاکار نہیں ہوں۔ میں معاشقہ کروں گی۔ تو مجھے کس کا ڈر ہے۔ بہتر ہے۔ تم اپنی زبان کو لگام دو۔ میرا کوئی عزیز دوست لازمی نہیں کہ میرا عاشق بھی ہو۔ اور اگر بالفرض ہو بھی تو تم ہمارے درمیان نہ پڑو۔"

والٹر نے کہا "تمہارا کالا جنگلی دوست ...."

میں تڑپ کر تیزی سے آگے بڑھا۔ گویا حملہ کروں گا۔ مگر ایملی نے مجھے روک لیا۔ اُس نے جھلا کر بھائی سے کہا "تمہاری عقل میں کچھ فتور

ہے۔ والٹر تم اپنی "وہسکی" میں پانی زیادہ ملا کر پیا کرو۔۔۔۔۔۔ بہتری اب اسی میں ہے کہ تم جاؤ اپنے راستہ۔ مگر نہیں! لو ہم خود جاتے ہیں۔۔۔۔۔"

ہم دونوں اس لڑاکا والٹر کو وہیں چھوڑ کر واپس چلے۔ وہ خاموش کھڑا تھا۔ کھڑا رہا۔ جیب میں ہاتھ ڈالے۔ وہسکی کی ترنگ میں کھڑا جھوم رہا تھا۔ ہمیں دونوں کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ دیکھتا رہا۔ مڑ مڑ کر ہم نے اُسے دیکھا۔ ہنسے اور ہنس ہنس کر اُسے دیکھا۔ قہقہے لگائے۔ جب ذرا دُور نکل گئے۔ تو ایک دفعہ پھر مڑ کر دیکھا۔ ایک دم سے آیملی رُک گئی۔ مڑ کر اُس نے پُکارا:۔

"والٹر۔۔۔۔۔ والٹر۔۔۔۔۔ صُلح کرتے ہو۔ صُلح۔ صُلح۔۔۔۔۔۔ کرتے ہو؟"

سر ہلا کر والٹر نے کہا "نُو۔۔۔۔ و۔۔۔۔۔۔" (اُنگلی کے جھٹکے سے اپنی بیزاری ظاہر کرتے ہوئے)

آیملی نے کہا "میں تمہاری منگیتر کے باپ کو کنجوس نہ کہونگی۔۔۔۔"

والٹر نے کہا "نُو۔۔۔۔۔۔ و۔۔۔۔۔ و"

"والٹر دوبارہ سوچو۔۔۔۔۔۔ صلح کرتے ہو۔۔۔۔۔۔"

والٹر نے پھر وہی جواب دیا "نُو۔۔۔۔۔۔۔۔ و۔۔۔۔۔۔۔ و۔۔۔۔ بھاگ جاؤ۔۔۔۔۔۔"

ایملی نے کہا: "میں پھر اُسے (والٹر کی منگیتر کو) ہر جگہ چھپکلی کہونگی.....!"

والٹر نے گھبرا کر کہا: "تم ہرگز ایسا نہیں کر سکتیں"۔ (آگے بڑھ کر) "تم اُسے کئی آدمیوں کے سامنے خوبصورت تسلیم کر چکی ہو۔ وعدہ کر چکی ہو۔ کہ چھپکلی نہ کہو گی۔ اس کی شہادت موجود ہے"۔

"مگر میں اُسے چھپکلی ضرور کہونگی"۔

والٹر آگے کو بڑھتے ہوئے: "تمہاری اس ناشائستہ حرکت سے اُسکے نازک دل کو صدمہ پہنچنے کا سخت اندیشہ ہے۔ تم ہرگز ایسا نہیں کہہ سکتیں بھلا سوچو تو اس کا باپ کیا کہے گا دل میں۔ وہ کیا سوچیگی"۔

"مگر میں اُسے چھپکلی ضرور کہوں گی...... اُس کے باپ کو منحوس اور کنجوس کہوں گی"۔

والٹر اور آگے بڑھ چکے تھے۔ کہنے لگے: "میری پیاری بہن کیا تو ابھی ابھی صلح کرنے کو نہیں کہہ رہی تھی۔ یہ تجھے کیا ہو گیا؟"

"پیارے والٹر صلح کرتے ہو؟"

"ہم لڑے کب تھے؟" والٹر نے کہا۔

میری طرف اشارہ کر کے ایملی نے والٹر سے کہا۔ "پیارے بھائی کیا تم میرے دوست سے تعارف حاصل نہ کرو گے؟"

اُفوہ! انگریز کی سادہ لوحی یا شراب کے نشہ ان دونوں میں سے ایک

پر ضرور قربان جائیے! یہ مسخرا والٹر مجھ سے سچ مچ صاف دل ہو کر مصافحہ کر رہا تھا
میں نے غور سے دیکھا واقعی اس کا دل کینہ سے پاک تھا۔

"غالباً ہم بہترین دوست ہیں" چلتے ہُوئے والٹر نے کہا۔

"اوہو!" میں نے کہا "قطعی۔ اس میں شک کی گنجائش کسی طرف سے نہیں"

ایملی نے بھائی سے کہا "غالباً ہم دونوں خود مختار اور سمجھدار ہیں۔ اور
اپنے معاملات کو خود بہتر سمجھتے ہیں"

والٹر نے اس کو تسلیم کیا۔ درحالیکہ وہ بہن کی شکایات آزادی سُن کر محض
تین دن کے لئے حرف گیری کی غرض سے خاص طور پر اپنے والد بزرگوار کی فرمائش
پر آئے تھے۔

والٹر اپنی راہ چلا گیا اور ہم۔ ہم دونوں؟ نہ پوچھئے جی میں آتا تھا کہ اس دلچسپ
واقعہ کی نوعیت پر غور کریں۔ اور قلا بازیاں کھائیں۔ سیدھے ہم دونوں ہوٹل میں
پہنچے ناشتہ کیا ہلکا۔ اور پھر وہاں سے ایک جوئے گھر کے مشاغل کو بنظرِ
استحسان دیکھتے ہُوئے ہال روم کے دروازہ تک تو اپنے پیروں پر رہے
اور پھر اندر داخل ہوتے ہی "جیز" کے نغموں کی حرکت کی وجہ سے سر کے بل ....!

زنبور

۱

سُنا کرتے تھے کہ پائیریا ایسا موذی مرض ہے کہ جس دانت میں ہو جائے اس کے پاس والے کی خیریت نہیں۔ پہلے تو ہم یہ سمجھا کرتے تھے کہ یہ ڈاکٹر لوگ یوں ہی ڈراتے ہیں لیکن ذاتی تجربہ سے معلوم ہُوا کہ ڈاکٹروں کا کہنا بالکل صحیح ہے اور اب میں اگر دیکھتا ہوں کہ کسی دوست کے دانت میں پائیریا ہو گیا تو گھبرا کر یہی کہتا ہوں کہ بھیّا بچاؤ اس کے پاس والے دانت کو!

۲

میں کالج میں پڑھتا تھا کہ مجھے پائیریا ہو گیا وہ بھی ایسے کہ مجھے خبر تک کی نہ ہونے پائی، اور اس موذی مرض نے آ کر میری ایک اچھی خاصی داڑھ کو زیر کر لیا پہلے تو اس داڑھ میں کبھی کبھار ٹیس ہُوئی، خون نکلا اور کبھی بادی پانی نکلا اور کبھی سُوج گئی اور پھر آپ ہی اچھی ہو گئی، لیکن پھر ایک روز باضابطہ اس میں درد اُٹھا، بورڈنگ میں رہتا تھا پہلے تو پروا نہ کی، شفاخانہ سے دوا منگا کر لگالی، کلی غرارے کئے لیکن جب تکلیف زیادہ ہُوئی تو تیسرے دن کالج کے ہسپتال جانا پڑا۔

کسی زمانے میں آگرہ میں ڈاکٹر بنانے کا اچھا کارخانہ تھا، تھوڑا بہت انگریزی پڑھا کوئی ہاتھ لگ جاتا اُسے دواؤں اور بیماریوں کے انگریزی نام یاد کرا کے خوب سمجھا دیتے کہ دوا اور مرض دو مختلف چیزیں ہیں، جب یقین ہو جاتا کہ طالب علم مرض میں دوا کے بجائے مرض نہیں تجویز کریگا تب اس کا نام ڈاکٹر دھر دیتے نام کی برکت اور تندرستوں کی کثرت بہت جلد اُسے سچ مچ ڈاکٹر اور اچھا ڈاکٹر بنا دیتی، اسی قسم کے یہاں ایک پُرانے "ڈاکٹر صاحب" تھے۔ میں کیا بتاؤں حُلیہ۔ سمجھ میں نہیں آتا، بس یہ سمجھ لیجئے، تاش کے پتے سب کے سب پانی بھری بالٹی میں ڈال دیجئے، تھوڑی دیر بعد جب خوب بھیگ جائیں تو چڑی کا بادشاہ لیکر دُھوپ میں سُکھا لیجئے (سایہ میں نہیں) اور عین اسکی ناک کی پھنگی پر عینک اور لگا دیجئے سُوکھے سا کھے۔ ڈاڑھی چڑھائے کھٹے کو ڈاکٹر اور دیکھنے میں سچ مچ چھوٹی ٹہڑ، مگر بلا کے تیز۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے: "منہ پھاڑ دو" میں نے منہ پھاڑا اور وہ دیکھنے لگے۔ مگر توبہ کیجئے کون دیکھتا ہے۔ میں سمجھا کہ میرے ہونٹ دیکھ رہے ہیں مگر در اصل میں تو منہ پھاڑے تھا اور وہ دیکھ رہے تھے میری عینک "مسکرا کر بولے: "یہ کمانی کتنے کی ہے؟" میں نے منہ پھاڑے ہی جواب دیا "ڈیڑھ روپیہ تی" بولے۔ بہ بہ... بس "دیکھ لیا" حالانکہ واقعہ ہے کہ دیکھتا کون مسخرا ہے اگر مریض وہمی نہ ہوں تو اصل پوچھئے تو دیکھا بھالی میں دھرا کیا ہے حکیم صاحبان ہی کونسا تیر مار لیتے ہیں دیکھ کے۔ اور ہسپتالوں میں اگر مریض علاج سے پہلے دیکھے جانے

لگیں تو غالباً ہر ڈاکٹر اس کام کے لئے محکمہ سے دو تین نئے کمپونڈر مانگنے پر مجبور ہو

ڈاکٹر صاحب نے حضرت کمپونڈر سے پکار کر کہا "ارے بھئی ان کے "کریازوٹ" لگا دو!" یہ خبر نہیں کہ دو روز سے یہی کریازوٹ" لگایا جا رہا ہے اور ڈاڑھ ہے کہ کسی کل چین نہیں لینے دیتی۔ چنانچہ میں نے جب ڈاکٹر صاحب سے یہ عذر کیا تو اُنہوں نے ٹھہرنے کو کہا کہ ابھی آیا۔

ڈاکٹر صاحب نے پانچ منٹ میں درد کافور کرنے والے نسخہ کا ذکر کیا تو میں خوش ہُوا لیکن جب یہ معلوم ہُوا کہ ڈاڑھ اُکھیڑ دی جائیگی تو میں راضی نہ ہُوا۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر مجھ سے کہا مُنہ پھاڑو۔ میں اسٹول پر بیٹھا تھا اور وہ کھڑے تھے۔ دو ایک دفعہ تو ایسے دیکھا، معلوم ہُوا ابھی مُنہ میں گھُس جائینگے۔ پھر اپنی اُنگلی ڈال کر میری ڈاڑھ دیکھی۔ سر ہلا کر اُنگلی دھوتے ہُوئے بولے "بس اسکی تو ایک دوا ہے۔ . . . . . ." میرے ایک دوست بھی ساتھ تھے، چنانچہ اُنہوں نے بھی مجھے ورغلانا شروع کیا کہ میں راضی ہو جاؤں۔ مگر میں راضی نہ ہُوا ڈاکٹر صاحب نے دانت اُکھڑوانے کے فوائد پر لکچر دینا شروع کیا اور کہنے لگے کہ خود آپ کے شیخ الرئیس قانون میں لکھ گئے ہیں کہ دانت کا بہترین نہیں بلکہ علاج ہی یہ ہے کہ اُسے اُکھڑوا ڈالو

---

[1] ایک منحوس دوا جو دانت کے درد کی دوا تو ہے لیکن فائدہ خاک نہیں کیا کرتی۔

میں نے اس کا یہ جواب دیا کہ اوّل تو میری ڈاڑھ میں سخت درد ہو رہا ہے اور جلد علاج ہونا چاہیئے، اور رہ گئے شیخ الرئیس تو وہ قطعی "میرے" نہیں ہیں اور بالفرض اگر میرے ہی ہوں تب بھی وہ تو وہ اگر کوئی "مخل الرئیس" بھی۔ اس قسم کی لکھا پڑھی کر کے یہ چاہتے کہ ہم بیٹھے بٹھائے اپنا دانت اکھڑوا ڈالیں تو یہ حماقت ہم سے نہیں ہونے کی۔

مگر میں نے عرض کیا نا کہ یہ ڈاکٹر صاحب بڑے تیز تھے فوراً انہوں نے ایک عجیب و غریب قصّہ شروع کر دیا۔ کہنے لگے کہ "پرانے زمانے میں جب جالینوس بقراط وغیرہ سب کے سب بڑے بڑے حکیم زندہ تھے تو سب نے مل کر صلاح کی کہ موت کا علاج سوچنا چاہیئے۔ چنانچہ سب حکیموں نے طب کی موٹی موٹی کتابیں دیکھ بھال کر ایک زبردست نسخہ تیار کیا جو عرصہ کی جانچ پڑتال اور ترمیم و تنسیخ کے بعد ٹھیک قرار دیا گیا۔ اس نسخہ میں لاکھوں دوائیں اور جڑی بوٹیاں شامل تھیں اور عرصہ تک گھوٹا چھانی ہوتی رہی آخرش ایک دن وہ تیار ہو گیا۔ تجویز یہ تھی کہ چھ مہینہ تک مختلف عرقوں میں یہ بھگو یا جائیگا اور جب ٹھیک خمیر اٹھ آئیگا تب اسکو پکایا جائیگا اس غرض کے لئے حکیموں نے جنگل میں ایک زبردست دیگ نصب کی جس میں سب دوائیاں بھگو دی گئیں اور کئی حکیم دن رات اس کی نگرانی پر تعینات کر دئے گئے۔

میں نے درد سے بیتاب ہو کر کہا، "مگر ڈاکٹر صاحب میں تو درد میں مر رہا ہوں........"

ڈاکٹر صاحب نے بات کاٹ کر جواب دیا "میں وہ دوا آپ کو بتا رہا ہوں جو دنیا میں بہترین ہے...... خیر۔ سنیئے اور دیکھئے کہ ابھی ابھی اس قصہ کے ختم ہوتے ہی آپ کا درد جاتا رہیگا........ قصہ مختصر جب یہ تمام ادویات بھیگ چکیں اور خمیر ٹھیک آگیا تب حکیموں نے آکر دواؤں کو جانچا اور طے کیا کہ فلاں دن فلاں وقت دیگ کے نیچے آگ روشن کر دی جائے، چنانچہ آگ روشن کر دی گئی جو مدت دراز تک دن رات مشتعل رہی باری باری سے بڑے بڑے حکیم دن رات پہرہ دیتے تھے، اور نگرانی کرتے تھے۔

جب آگ روشن ہوئے عرصہ ہو گیا تو سب حکیم جمع ہوئے اُنہوں نے دوا کا قوام جانچا اور معلوم کر لیا کہ اگر اتنی آنچ دیں گے تو فلاں دن جا کر یہ ادویات کُشتہ ہو جائیں گی۔ اور وہ دن چاند کی چودھویں رات کا ہوگا۔ دراصل اس عظیم الشان دیگچہ کے ڈھکنے میں ایک سُوراخ بھاپ نکلنے کے لئے تھا۔ اب دواؤں کا زور اور حکیموں کی کرامات کہئے کہ دواؤں کی رُوح کشتہ ہو کر اس سُوراخ سے نکلنے والی تھی اور اُس سے موت کی دوا پوچھنا تھی۔"

———— : ۳ : ————

جب دواؤں کے کشتہ ہونے کا وقت قریب آیا اور بھاپ کے بجائے

دیگ کے ڈھکنا سے سوختہ ادویات کے دھوئیں کے بھبکے کے بھبکے نکلنے لگے اور وقت قریب پہنچا تو حکیموں کو اندیشہ ہُوا کہ کہیں یہ رُوح نہ نکل جائے اور ہم رہ جائیں۔ لہٰذا بڑے بڑے حکیم پہرہ پر مقرر ہوئے۔ سب باری باری سے پہرہ دیتے تھے، آخر کو چاند کی چودھویں رات آئی۔

رات کا سناٹا تھا۔ چودھویں رات کا چاند جنگل میں کھیت کر رہا تھا ایک بڑا زبردست حکیم دیگ پر پہرہ دے رہا تھا باقی حکیم فاصلہ پر پڑے بے خبر سو رہے تھے کیونکہ اپنی اپنی ڈیوٹی اور پہرہ سے تھکے ہُوئے تھے دیگ میں سے دھواں نکلنا بند ہو گیا تھا اور ہر لحظہ یہی انتظار تھا کہ اب چڑیا نکلے اور کب چڑیا نکلے۔ حکیم کی آنکھ دیگ کے اوپر سُوراخ کی طرف تھی۔ حکیم انتہا سے زیادہ اپنی ڈیوٹی کا خیال رکھتا تھا مگر بدقسمتی سے آپ سے کہیں زیادہ اُس کی ڈاڑھ میں خود درد ہو رہا تھا۔ . . . . . . "

"اچھا!" میں نے مسکرا کر کہا۔" پھر اُسکی بجائے کوئی دوسرا حکیم کیوں نہ تعینات کیا گیا؟"

ڈاکٹر صاحب نے کہا:" چونکہ اس کی ڈاڑھ میں آپ کی طرح سخت درد ہو رہا تھا، بلکہ آپ سے بھی زیادہ اور نیند کوسوں دور تھی لہٰذا حکیموں نے یہ سوچا کہ بہتر ہے ان کو ویسے بھی نیند نہیں آ رہی ہے اور بیکلی میں گھوم رہے ہیں، پہرہ چوکی اچھا دینگے، ورنہ اندیشہ تھا کہ اگر کوئی دوسرا حکیم تعینات کیا گیا اور عین

موقع پر اُس کو نیند آ گئی تو برسوں کی محنت رائگاں جائیگی۔ خیر مطلب یہ کہ حکیم جی پہرہ دے رہے تھے مگر ڈاڑھ کے درد کی وجہ سے بیحد بیکل تھے۔

جب رات آدھی آئی۔ چاند کی روشنی اور درد کی تکلیف شباب کو پہنچی حکیم کا یہ حال کہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے۔ مگر واہ رے استقلال آنکھ دیگ پر تھی کہ یکایک دیگ میں پہلے سناٹا ہوا، اور پھر سوراخ۔ پھڑ پھڑاہٹ ہوئی۔ ایک زریں طوطی چہک کر دیگ کے سوراخ سے نکلی اور دیگ کے گرد چرخ مار کر بلند ہو کر اُس نے حکیم سے پوچھا "کس مرض کی دوا پوچھتا ہے؟" بدقسمتی سے یہ وقت تھا کہ حکیم جی کی ڈاڑھ کا درد انتہا پر تھا۔ دوا تو موت کی پوچھنا تھی مگر فی الحال تو ضرورت ڈاڑھ کے درد کی زیادہ تھی۔ جلدی میں حکیم کے منہ سے یہی نکل گیا۔ "ڈاڑھ کے درد کی دوا"

طوطی نے چہک کر جواب دیا "زنبور" اور یہ لاثانی دوا بتاتے ہی جل کر راکھ ہو کر گر پڑی! اب یہاں یہ کہ حکیم کو کیا کہنا چاہیئے تھا اور کیا کہہ گیا یا یہ کہ دوسرے حکیموں نے جب سنا ہوگا تو اُن کو "بھیسٹ" کر دھر دیا ہوگا اس سے ہمیں بحث نہیں۔ یہاں تو یہ بتانا مقصود ہے کہ برادرم دانت کے ہر مرض کی دوا یہی ہے اُسی حکیم کے وقت سے چلی آ رہی ہے اور یہی بہترین دوا ہے۔ سب سے بڑا اعتراض آپ کا یہی تھا کہ طب قدیم اس اصول کو نہیں مانتی کہ علاج کے بدلے وہ عضو ہی ختم کر دو تو اب میں نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ نسخہ طب قدیم ہی کا

ہے .... لائیے اُکھاڑ دوں ڈاڑھ، ورنہ کہئیے تو پھر لیپا پوتی کر دوں"۔

میں نے جو اُن سے پوچھا کہ صاحب "لیپا پوتی" کا کیا مطلب" تو معلوم ہوا کہ اس سے یہ مطلب ہے (جو آجکل حضرت قبلہ خواجہ صاحب اپنے دانتوں کے ساتھ کرا رہے ہیں) مسوڑے اور دانت صاف ہو رہے ہیں میل نکالا جا رہا ہے۔ نشتر دئے جا رہے ہیں۔ انجکشن دئے جا رہے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ کل علاج جس سے پائیریا اچھا ہو جاتا ہے۔

میں نے "لیپا پوتی" پسند کی۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً گرم پانی تیار کرایا اتنے میں "لیپا پوتی" کے اوزار اور دوائیاں بھی آگئیں۔ پھریریاں چمٹیاں، موچنے اور طرح طرح کے چمکتے ہوئے درجنوں اوزار برابر کی میز پر رکھدئے گئے۔

اس لیپا پوتی کی ابتدا، نیمگرم پانی کی کلّیوں سے ہوئی جس میں کنوئیں میں ڈالنے والی لال دوا گھلی ہوئی تھی۔ میں ایک نیچی سی کرسی پر منہ پھاڑ کر اس لئے بٹھا دیا گیا کہ ہسپتال کی چھت دیکھتا رہوں اور لیپا پوتی شروع ہو گئی۔

میرے منہ کے اندر متعدد پھریریاں آ رہی تھیں جا رہی تھیں طرح طرح کی چمکتی ہوئی سلائیاں، قینچیاں، موچنے اور اسی قسم کے حضرات کی آمد و رفت سرعت کے ساتھ جاری تھی میں اس طرح اطمینان میں کہ کیا کہنا ہے ڈاکٹری کا ہر کام کے لئے اوزار علیحدہ ہے، قدم قدم پر نیا اوزار منہ میں آتا ہے، اس طرف دھیان بھی نہ تھا کہ کون اوزار کیسا ہے اور کون کیسا۔ نتیجہ اس بیخبری کا کچھ اچھا نہ نکلا

ڈاکٹر صاحب نے بے خبری کی حالت میں میرے منہ میں ڈاڑھ اُکھاڑنے والا زنبور ڈالدیا۔ میں نے اُسے دیکھ تو لیا مگر خطرہ سے اور ڈاکٹر کی نیت سے اس وقت باخبر ہوا جب اس نالائق زنبور کے خوفناک جبڑے میری ڈاڑھ گرفت میں لے رہے تھے۔ گھبرا کر میرے مُنہ سے "غاآ ...." قسم کی آواز نکلی۔ بلکہ پوری نکلنے بھی نہ پائی تھی کہ ایک عظیم الشان جھٹکا سا ہُوا یہ معلوم ہُوا کسی نے جبڑے میں ایک گولی لگادی جس سے دماغ تک ہل گیا۔ ایک ڈاکٹر کے دو ڈاکٹر نظر آگئے، ایک نہایت ہی ہیبت ناک اور عظیم الشان عو۔ و۔ و ... ع، کرتا ہُوا میں کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب شادان و فرحان۔ اُن کے ہاتھ میں وہ موذی زنبور اور زنبور کے جبڑوں میں میری عزیزی ڈاڑھ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میرا "پہلا دانت" اس طرح ضائع ہُوا لیکن میری دانست میں یہ قصہ نامکمل رہ جائیگا۔ اگر اس قصہ کو یہیں چھوڑ دوں۔

ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر کہا: "موڑ کٹا پیٹر گئی" ...... دیکھا! ایک ذرا سی تکلیف کے ڈر سے اتنی تکلیف اُٹھا رہے تھے .... یہ دیکھو .... (ڈاڑھ کی جڑ دکھا کر) (بعد میں دیکھا تو خراب نہ تھی) اب کہاں گیا درد؟ کہئے ...."

میں کچھ عرض نہیں کرسکتا کہ اس ظالم ڈاکٹر نے میرے ساتھ کیا ستم کیا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ پہلے خون تھوکوں یا قسمت کو روؤں یا اس ڈاکٹر کو خود ایک

ڈاکٹر کا محتاج کر دوں۔ مگر توبہ کیجئے۔ تن بدن میں رعشہ۔ تھوکنے سے فرصت کہاں
مگر کچھ بھی ہو میں نے جل کر اور دہاڑ کر کہا:۔

"۔۔۔۔۔۔ ارے او ازلی ڈاکٹر۔ مریضوں کے دشمن۔ یہ کیا غضب کیا۔۔۔۔۔
(آخ تہوہ) میری دُکھتی ہوئی ڈاڑھ کے بدلے برابر والی بھلی چنگی مضبوط ڈاڑھ
اُکھاڑ لی! درد تو جوں کا توں نہیں بلکہ دوگنا چوگنا ہو رہا ہے!"

اور حضرت یہ واقعہ تھا کہ اس آدمی نما ڈاکٹر نے گڑبڑ سڑبڑ میں برابر والی
بھلی چنگی جمی جمائی تندرست ڈاڑھ پکڑ لی! دُکھتی ہوئی ڈاڑھ کے بدلے! ادھر میرا
مُنہ پھٹا ہوا اور اُس میں گھُسی ہوئی ایک سڑانسی یعنی زنبور! قبل اسکے کہ میں یہ
کہہ سکوں کہ "ظالم اس ڈاڑھ میں بالکل درد نہیں تو اسے چھوڑ" وہ غریب اُکھڑ
بھی چکی تھی۔

اب خود ہی سوچئے۔ ڈاکٹر سے لڑتا گیا خاک۔ خون ہے کہ نکلا چلا آرہا ہے
دوا، علاج کی اور بھی سخت ضرورت پڑ گئی۔ ہمارے اوپر تو یہ وقت اور ڈاکٹر صاحب
ہیں کہ قائل ہی نہیں ہوتے، اصل دُکھ والی ڈاڑھ جس میں پائیریا حلول کر گیا ہے
جوں کی توں موجود ہے۔ بڑی مشکل سے جب یقین دلایا تو فرماتے ہیں "اوہو!
۔۔۔۔۔۔ مگر لاؤ اب اُسے اُکھیڑ دوں" ماشاء اللہ میں نے کہا۔ مجھے بخشئے کچھ
ہی ہو یہ ثابت ہو گیا کہ پائیریا ایسا مرض ہے کہ جس دانت میں ہو جائے اُسکے
پاس والے دانت کی خیریت نہیں ہے۔ جس میں پائیریا ہو وہ موجود

اور قریب والی ڈاڑھ غائب! فاعتبرو!

اسکے بعد میں دانت اکھڑوانے کے بیحد خلاف ہوگیا اور تہیّہ کر لیا کہ ہرگز ہرگز دانت نہ اکھڑواؤں گا۔ لیکن باوجود اسکے آج آپ دیکھ سکتے ہیں کہ میرے مُنہ میں کئی مصنوعی دانت ہیں۔ درحالیکہ میں اُن میں سے قطعی نہیں ہوں جو محض شوق اور فیشن کی خاطر مصنوعی دانت لگائے پھرتے ہیں۔ اور وہ بھی ایسے کہ دور ہی سے آپ دیکھ کر کہہ دیں کہ ان حضرات نے اپنی عقل ڈاڑھ اکھڑوا ڈالی ہے۔

---- ۴ ----

مندرجہ بالا واقعات سُن کر کم از کم آپ اس بات کے تو قائل ہو گئے ہونگے کہ ان دانت والے ڈاکٹروں سے ذرا بچنا چاہیئے اور یہ کہ پائیریا بڑا موذی مرض ہے اور اس کا علاج کرانے میں بڑی احتیاط لازمی ہے، ورنہ دانت جاتا رہتا ہے (حضرت قبلہ) دوران علاج میں خاص توجہ فرمائیں۔ ذرا دیکھ بھال کر اوزار کو مُنہ میں جانے دیں یہ بھی کمبخت گوروں کی فوج کی طرح سب ایک شکل کے معلوم ہوتے ہیں۔ درحالیکہ ان میں کچھ تو بیحد معصوم ہوتے ہیں کہ ان کو دانت کے قریب جانے بھی نہ دینا چاہیئے۔ اگر لاپرواہی برتی تو حضرت کون ٹھیک بقول کسے انسان کی نیّت بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔ گو یہ امر مسلّمہ ہے کہ ڈاکٹر پھر ڈاکٹر ہے۔ مگر بڑی حد تک چونکہ وہ انسان سے بھی ملتا جُلتا ہوتا ہے

لہٰذا قابلِ اعتبار نہیں۔ کیا خبر کب اس کی نیت بدل جائے۔

عرض ہے کہ اس تندرست ڈاڑھ کے اُکھڑنے کا مجھے بیحد رنج ہوا نہ کبھی بچاری دُکھتی تھی نہ تکلیف دیتی تھی "دردناک" پڑوسن کے تمام فرائض خود انجام دیتی تھی۔ ساتھ ہی دُکھنے والی ڈاڑھ پر مجھے غصہ بھی آرہا تھا بس نہ تھا کہ اس موذی کو انتقاماً نکلوا ڈالوں۔ مگر توبہ کیجئے ایک دفعہ جو ڈاڑھ اُکھڑوا لے تو اس کا مزہ جلد تھوڑی بھولتا ہے۔ جیتا دانت نکلوانا مذاق نہ باشد۔ تن بدن کانپ اُٹھتا ہے رُوح کو ایک جھٹکا سا لگتا ہے بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ موت کا ایک جھٹکا تھا۔

اس واقعہ کے بعد اس "دردناک" ڈاڑھ کے علاج کی مجھے فکر ہوئی اس کی "لیپا پوتی" کا اعلےٰ انتظام کیا۔ مدتوں علاج ہوتا رہا اور علاج بھی ایسا کارآمد و مفید کہ ایک چھوڑ دس دفعہ ہوشیار ڈاکٹروں نے پائیریا اچھا کر دیا، اس سے زیادہ اور کیا کامیابی ہو سکتی ہے۔ تمام دانت صاف کروائے۔ مسوڑھوں میں نشتر اور انجکشن دئے گئے۔ دہرہ دون سے ویکسین کا خاص انجکشن تیار ہو کر آیا، کلّیوں اور غراروں کے ایسے عجیب و غریب پروگرام بنے کہ مقصدِ حیات کلی غرارہ ہو گیا۔ جب دیکھو ایک انتظام اور نظام کے ساتھ برُش اور دوا ہاتھ میں کھڑے مُنہ چڑا رہے ہیں۔ حلق میں بدبودار دوائیں ڈال کر "غبن" کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ پان کھانا نہ صرف چھوڑ دیا گیا

بلکہ پان کھانے والوں کو دق کیا گیا۔ قصہ مختصر ایک آفت برپا کردی۔ پائیریا کے علاج میں وہ پابندئی اوقات اور وہ ریاض کہ اگر بجائے اسکے دوسری طرف توجہ کرتا تو جنت اور اس کی سلطنت بیک وقت مل جاتی۔ جب تک یہ طوفان بپا رہے اس کی بھی فرصت رہی کہ بحث کرکے ثابت کردیں کہ پائیریا اچھا ہو گیا اور اس خوش قلبی میں ذرا ڈھیل پڑی نہیں کہ پائیریا جوں کا توں پھر موجود۔ نتیجہ یہ کہ آخرش معلوم ہو ہی گیا کہ اس لیپا پوتی سے پائیریا اچھا کرنا بھی ایک عیاشی ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ رئیسوں کا ایک شوق ہے چنانچہ بعد قیمتی وقت اور صحت ضائع کرنے کے معلوم ہوا کہ طبی چڑیا نے دیگ سے جو نکلکر کہا تھا وہ سچ تھا اور دانت کی دوا سوائے "زنبور" کے کچھ نہیں جب ہی تو شیخ الرئیس نے بھی اپنے قانون میں یہی لکھ دیا، جب یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی کہ پائیریا کا علاج سوائے "زنبور" کے کچھ نہیں تو ایک نئی بات کا پتہ چلا۔ وہ یہ کہ یہ امر بخوبی واضح ہو گیا کہ اگر دانت اکھڑنے میں تکلیف نہ ہو تو پائیریا کے مریض اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے دانت چھوڑ ایک سرے سے ناک تک اکھڑوا ڈالیں۔ چنانچہ سوال یہ درپیش ہوا کہ کوئی دنیا میں ایسی ترکیب بھی ہے کہ دانت بھی اکھڑ جائے اور درد بھی مطلق نہ ہو۔ معلوم ہوا کہ ایک نہیں بہت سی ترکیبیں ہیں لیکن میرے تجربہ سے معلوم ہوا کہ سوائے ایک تدبیر کے اور دوسری نہیں۔ عرض کرتا ہوں۔

معلوم ہوا کہ کوکین کا انجکشن لگوا لو تب بھی درد نہیں ہوتا۔ کسی نے کہا ایک گیس ہوتا ہے اس سے درد نہیں ہوتا۔ کسی نے بہت غور سے سب حال سُن کر درد کے وجود ہی سے اِنکار کر دیا اور کہا یونہی اُکھڑوا ڈالو۔ اسی سلسلہ میں دہلی کے ایک عزیز دوست نے قصّہ کو یوں مختصر کر دیا کہ لکھا "دہلی آجاؤ حسب دلخواہ کام بن جائیگا"۔

دہلی کا کیا کہنا۔ وہاں ایک سے ایک بڑا "دانت والا" ڈاکٹر موجود ہے۔ ایک صاحب کے بارہ میں سُنا کہ دانت ایسے اُکھیڑتے ہیں کہ پتہ بھی نہیں چلتا اور دانت اکھڑ جاتا ہے۔ مگر فیس زیادہ ہے۔ ہم نے دل میں سوچا کیا مضائقہ ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں گئے۔

——— :: ۵ :: ———

دروازہ ہی پر لکھا تھا کہ بغیر درد کے دانت علیحدہ کرنے کے ماہر ہیں۔ یہاں باچھیں کھِل گئیں، اوپر پہنچے تو وہ ٹھاٹ اور انتظام کہ دیکھا کیجئے۔ انتہا سے زیادہ نفیس کمرہ جو دلہن کی طرح سجا ہُوا تھا۔ ایک بڑی سی گول میز تھی جس پر انگریزی اخبار پڑے تھے۔ اردگرد ریشم کے گدّوں کی کرسیاں۔ ریشمی پردے لٹک رہے تھے۔ دو تین حضرات بیٹھے تھے۔ برابر کے کمرہ میں ڈاکٹر صاحب کا "میدان جنگ" تھا ایک بابو نما نوکر نے خفیہ طور پر کہا "ڈاکٹر صاحب ......"! اُنگلی اُٹھادی میں سمجھ گیا کہ کسی کے ساتھ مشغول ہیں۔

میں اور میرے دوست بیٹھ گئے۔ دو حضرات اور بیٹھے تھے، ایک تو دو غلے
یورو پین۔ روپیہ میں دو آنہ بھر انگریز۔ اور دوسری ایک انگلش خاتون۔ قریب
بیس برس کی عمر ہو گی۔ انتہا سے زیادہ بھولی صورت، جاذب نگاہ، دلفریب
مگر سادہ لباس زیب تن کئے ایک کان میں لمبا سا ہیرے کا آویزہ۔ ننگے سر
سنہری بال تھے۔ ہاتھ میں ایک مصوّر رسالہ تھا جو وہ بغور دیکھ رہی تھیں میری
نظر پڑی تو معلوم ہوا کہ کوئی مصری رسالہ ہے (عربی کا) جس کی تصویریں وہ بغیر عبارت
سمجھے دیکھ رہی تھیں، میں برابر میں بیٹھا تھا میری طرف استفسارانہ نظر ڈالی اور
رسالہ اپنے سامنے رکھ لیا۔ میں نے کہا "کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں"؟ انہوں نے
"بخوشی" اور رسالہ میری طرف کر دیا اور کہا "غالباً آپ اسے سمجھ سکتے ہونگے"۔ قصہ
مختصر ہم دونوں اس رسالہ کو دیکھ رہے تھے۔ اتنی عربی تو میں بھی جانتا ہوں
کہ تصویریں سمجھ سکتا۔ اسی دوران میں سامنے والے دو آنہ بھر انگریز نے بعد
معافی چاہنے کے ہم سب صاحبان سے پوچھا کہ کیا کبھی ہم میں سے کسی نے
دانت بھی اکھڑوایا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ خود اکھڑوانے آئے تھے۔ اب ہم
تینوں میں باتیں جو ہوئیں تو معلوم ہوا کہ ایک سے ایک زیادہ ڈرپوک ہے اور
اس جگہ سب اسی لئے آئے ہیں کہ درد نہ ہو۔ میں نے اپنے دانت اکھیڑے
جانے کا قصہ بیان کردہ سنایا دانت اکھڑنے کی تکلیفیں بتائیں کہ اتنے میں ڈاکٹر
صاحب آگئے کسی کی "لیپا پوتی" کر رہے تھے اُن کو رخصت کیا اور اب

ہماری باری آئی ان دونوں حضرات کو ڈاکٹر صاحب دیکھ ہی چکے تھے۔ دانت اُکھیڑنے کی فیس بھی لے چکے تھے، اور یہ دونوں صرف اپنی باری کے منتظر تھے ڈاکٹر صاحب نے اب مجھے کمرہ میں لیجا کر دیکھا۔ معلوم ہُوا کہ میرے چار دانت اکھیڑے جائیں گے، جس کی فیس بارہ روپے ہُوئے میں نے روپے گن دئیے اور پھر اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا اور وہ روپیہ میں دو آنے بھر انگریز اب دانت اُکھڑوانے چلے۔ اب میں اور خاتون صاحبہ اسکی منتظر کہ دیکھیں ان کے کتنا درد ہوتا ہے:۔

زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ کمرہ سے ایک دردناک لرزتی ہوئی صدا آئی "آآ..... ہ۔۔او۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وو۔۔۔۔۔۔۔۔غ،۔۔۔۔" اب میں چوکنا ہُوا! کیا یہ واقعہ نہ تھا کہ ان حضرت کے سخت درد ہو رہا تھا۔ اردگرد کے حالات۔ کمرہ وغیرہ۔ اور غیر معمولی خاموشی کو دیکھتے ہی درد نہ ہونے کا راز سمجھ میں آگیا۔ معلوم ہُوا کہ کتنا ہی درد کیوں نہ ہو ضبط کرنا پڑیگا اور یہ جگہ تو غل مچانے کے لئے سخت ناموزوں ہے کم ازکم مجھ سے تو ایسی حالت میں قطعی غل نہیں مچایا جا سکتا۔ اب سمجھ میں آیا کہ درد نہ ہونیکا یہ راز ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مطب کی خاموشی اور شائستگی نہ تو غل مچانے دیگی اور نہ یہ کہنے دیگی کہ صاحب ہمارے تو درد ہُوا آدھی فیس واپس لاؤ۔

میں نے ان خاتون صاحبہ کے روبرو ایک زرین تجویز پیش کی۔ وہ یہ

کہ کیا وجہ جو ہم اور آپ دونوں دانت اُکھڑوانے کے خیال سے باز نہ آئیں اور فیس واپس لے کر چلتے بنیں۔ اول تو اس امر پر میرے دوست خفا ہوئے اور پھر ڈاکٹر صاحب ان مس صاحبہ کی مزاج پرسی کو آ گئے۔ وہ دو آنہ بھر انگریز اپنے کلّے پر رومال رکھے نکلے۔ میں نے جو چپکے سے حال پوچھا تو مسکرا کر کہنے لگے۔
"آپ تو دانت اُکھڑوا چکے ہیں۔۔۔۔۔" یہ کہتے نکلے چلے گئے۔

اب میں ذرا چوکنا ہُوا۔ میں نے اپنے دوست سے کہا کہ باز آیا میں اس دانت اُکھڑوانے سے اُنہوں نے مجھے لتاڑا اور اطمینان دلایا کہ اتنے میں برابر والے کمرہ سے ایسی آواز آئی کہ میں نے سب سے پہلے گھبرا کر میز پر اُس عربی رسالہ کو دیکھا۔ کیونکہ مجھے ایسا معلوم ہُوا کہ خاتون موصوف شاید برابر والے کمرہ میں دانت نہیں اُکھڑوا رہی ہیں بلکہ عربی پڑھ رہی ہیں درحالیکہ وہ رسالہ تو نہیں لے گئی تھیں اور دانت بھی اُکھڑوا رہی تھیں، مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے پردہ کا کونہ اُٹھا کر بڑھ کر جھانک کر دیکھا۔ کیا عرض کروں چہرہ تکلیف کی تمازت سے سُرخ انگارہ۔ جس طرح بچّہ کے مُنہ سے دودھ پونچھا جاتا ہے ڈاکٹر خون کو ان کے مُنہ سے روئی کے گالوں سے پونچھ رہا تھا۔ میں اُلٹے پاؤں پھرا۔ آ کر بیٹھ گیا۔ مضطرب اور بے چین۔ باہر میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا دوست سے کہا ابھی آتا ہوں، ضرورت سے فارغ ہو آؤں۔ دو دو سیڑھیاں کر کے نیچے اُترا اور پھر جو وہاں سے

دھر کے بھاگا ہوں تو مڑ کر نہ دیکھا سیدھا گھر آکر دم لیا۔

کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد میرے دوست آئے۔ بیحد خفا۔ ایسے کہ میان سے باہر۔ جو منہ میں آیا مجھے سُنا ڈالا۔ اُدھر میرا یہ حال کہ فیس گئی کچھ پروا نہیں جان تو چھوٹی۔

—— ۶ ——

دو تین دن تک مختلف ڈاکٹروں کا امتحان لیا لیکن طبیعت مطمئن نہ ہوئی کہ ایک اور ہی معاملہ پیش آیا۔

میرے دوست ایک روز بازار سے آئے تو ایک عجیب و غریب امریکن ایجاد کا ذکر کیا، بجلی کی قوت سے ایسے دانت نکالے جاتے ہیں کہ قطعی درد نہیں ہوتا۔ یہ امریکن ایجاد حال ہی میں پیٹنٹ ہوئی ہے، اور دہلی میں صرف ایک جگہ ہے، مگر فیس بہت زیادہ ہے یعنی فی دانت سات روپیہ طے ہوا کہ شام ہی کو چل کر اُسے دیکھیں گے۔ یہ بھی طے ہو گیا کہ بس اسی ڈاکٹر سے دانت اکھڑوائینگے،

——————

ان ڈاکٹر کے یہاں پہنچے اور اس عجیب و غریب آلہ کو دیکھا۔ ایک کرسی کے آگے میز تھی اُس پر یہ آلہ رکھا ہوا تھا۔ بجلی کے پنکھے کی سی ڈوری تھی جو دیوار میں فاصلہ پر نصب تھی، اور اس ڈوری کے سرے پر ایک پیتل کا ولایتی لٹو لگا تھا۔ جس میں ایک بلور کی موٹی سی سلاخ تھی، اس پر پیتل کا دبیز خول چڑھا ہوا

تھا۔ یہ سلاخ میز پر رکھی تھی۔ دانت اکھڑوانے والا اس سلاخ کو دونو مٹھیوں میں لے کر زور سے دباتا تھا۔ جتنا بھی زور سے دبائے اتنا ہی درد ہونے کا امکان جاتا رہتا تھا۔ گویا درد کا ہونا نہ ہونا خود مریض کے ہاتھ میں تھا۔ اگر گرفت ڈھیلی کردے گا تو درد ہوگا ورنہ قطعی نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑے بڑے لوگوں کے سرٹیفکٹ دکھائے جنہوں نے اس آلہ کو استعمال کیا تھا۔ میں نے پڑھے تو معلوم ہوا کہ اب اس سے بہتر کوئی تدبیر ناممکن ہے۔ فوراً راضی ہوگیا کہ ابھی ابھی میرے دانت اکھاڑ دو۔

میں نے کرسی پر بیٹھ کر سلاخ کو مضبوطی سے دونوں مٹھیوں سے پکڑا اور ڈاکٹر صاحب نے کہا اُسے زور سے بھینچیے اور خود دانت اکھاڑنے کا زنبور لے کر آگے بڑھے۔ میں نے حکم کی تعمیل کی اور پوری قوت سے سلاخ کو بھینچا۔ ڈاکٹر صاحب نے ذرا رک کر کہا۔ کہ واہ جناب آپ اس آلہ کا قصور بتائیں گے اور زور سے بھینچیے۔ اور زور سے .... اور زور سے!!

اب میں نے اس سلاخ کو اتنے زور سے بھینچا کہ میرے تن بدن میں رعشہ سا آگیا۔ رگ رگ ہے کہ دکھ رہی ہے اور ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ "اور زور سے ..... اور زور سے ....."

اب میرا یہ حال کہ اپنی قوت کا آخری زور تک لگائے دے رہا ہوں

بدن کی تمام جسمانی قوتیں ہیں کہ اسی سلاخ پر آکر ختم ہو رہی ہیں۔ بیٹھا بیٹھا ہانپ رہا ہوں۔ کانپ رہا ہوں۔ جب میری شہزوری شباب پر پہنچ کر قائم ہو گئی تو ڈاکٹر صاحب نے دیکھا اور کہا "ہاں بس اسی حال پر قائم رہیگا!" یہ کہکر آگے بڑھے۔ میں نے منہ کھولا اور انہوں نے کہا "ہاں۔ لگائیے زور........ ..... ون........ ٹو......"

میں نے ایک آخری اور عظیم الشان جدوجہد کے ساتھ اپنی روح تک کا زور اس سلاخ کو دبانے پر لگایا۔ ایسا کہ ایک دم سے میں لرز اُٹھا۔ ادھر ڈاکٹر صاحب نے کہا... "ہات تری"...... ڈاڑھ اکھڑ چکی تھی۔ میں نے مٹھیاں ڈھیلی کر دیں، مگر انگلیاں جوں کی توں رہ گئی تھیں میری تن بدن کی چولیں ڈھیلی ہو گئیں۔ میں پست ہو کر ہانپ رہا تھا۔ رہ گیا درد تو درد قطعی نہیں ہوا تھا قطعی نہیں۔

میں نے راضی خوشی چاروں دانت اُکھڑوا ڈالے اور اس امریکن ایجاد سے بیحد خوش ہوا۔ اور نہایت ہی زوردار سرٹیفکیٹ ڈاکٹر صاحب کو دیا اور فی دانت سات روپیہ کے حساب سے فیس ادا کی۔ مگر میں دیکھ رہا تھا کہ نہ صرف میرے دوست بلکہ خود ڈاکٹر صاحب اور دو ایک حضرات جو وہاں یہ کارروائی دیکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا "آپ کے ساتھ خاص رعایت ہے اور صرف تین روپے فی دانت چارج ہوگا!" یہ کہہ کر باقی روپے واپس کر دئے اور اس پر میرے دوست

نے لگا یا فرمائشی قہقہہ۔

میں احمقوں کیطرح دیکھ رہا ہوں سب ہنس رہے تھے، دریافت پر آخرش وجہ معلوم ہوئی،
اس آلہ کی ڈوری میں نہ تو بجلی کا تار تھا اور نہ اس میں برقی رو آسکتی تھی۔ میں
نے غور ہی نہ کیا۔ سامنے والی دیوار پر بجلی کے تاروں سے علیحدہ اس ڈوری کا دوسرا سرا
دیوار میں یونہی ایک لکڑی میں لگا ہوا تھا۔ نہ بجلی نہ وجلی۔ خالی خولی ایک پیتل کی سلاخ
پکڑے میں وہر دہر کے دبا رہا تھا۔ اس خیال میں کہ اسکے ذریعے سے بجلی کی ایک عجیب
غریب رو سلاخ دبانے سے میرے جسم میں آرہی ہے۔ لاحول و لاقوۃ میں ایسا احمق بھی تو نہیں
ہوں، پھر کیسے دھوکہ میں آگیا۔ لاحول و لاقوۃ۔ احمقوں کی طرح خفت کی ہنسی ہنس رہا ہوں
اب دانت اکھڑنے پر غور جو کرتا ہوں تو ایسا خیال ہوتا ہے کہ درد ہوتا ہے کہ درد
ہوا تھا۔ مگر کتنا اور کیسا؟ کچھ پتہ نہیں۔ وہ شہ زوری کر رہا تھا اور درد گاؤ زوری
کر رہا تھا کہ قطعی خیال نہیں۔

معلوم ہوا کہ یہ آلہ ان ڈاکٹر صاحب نے خود ایجاد کیا ہے ان لوگوں کے لئے جو نہ صرف
دانت اکھڑوانے سے ڈرتے ہیں بلکہ دوست احباب کا اس سلسلہ میں میری طرح ناطقہ بند کر دیتے
ہیں۔ انکو یہ سزا دی جاتی ہے کہ بغیر کوکین انجکشن کے انکے دانت چٹک لئے جاتے ہیں۔
ان ڈاکٹر صاحب کا مطب گھنٹہ گھر کے آس پاس ہے جہاں یہ عجیب و غریب آلہ دیکھا جا سکتا ہے،
اب آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پائیریا کا علاج میری طرح کرانا چاہیئے یا نہیں
مگر کم از کم ایسے بھی ہو سکتا ہے۔ فقط ۔

کرکٹ میچ

۱
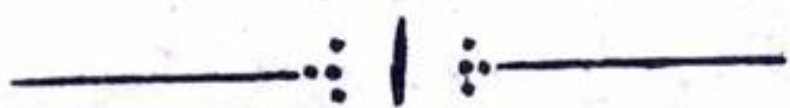
کرکٹ اور کرکٹ میچ پر آجکل برسات کے موسم میں کوئی مضمون لکھنا
"بے فصلی" سی چیز ہے، بالخصوص جبکہ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ کرکٹ کے واہیات
میچوں کا حال اور ان کی خبریں چھاپتے چھاپتے اخبار والوں نے پبلک کو
پست کر دیا۔ اور پھر اب تو ایم سی سی والے بھی ہندوستان سے "آدٹ"
ہوگئے ورنہ بہت ممکن ہے کہ یہ مضمون اگر کچھ پہلے شائع ہوتا تو ہمارے
ہندوستانی کھلاڑی کرکٹ کا ایک ایسا گُر جان جاتے کہ ایک ہی مقابلہ میں
ایم سی سی کی عقل راہ پر آجاتی۔

بہت ممکن ہے کہ آپ یہ سوچیں کہ یہ ایک مضمون نگار غریب کیا
جانے کرکٹ اور کرکٹ کی باتیں! مگر عرض ہے، اکثر میدان کارزار میں لٹھ کام
آتے ہیں اور تلواریں دھری رہ جاتی ہیں، اور پھر میں کرکٹ میں ایسا گمنام یا
اناڑی بھی تو نہیں، مجھے تسلیم ہے کہ اسکول کی ٹیم کے کپتان سے ہمیشہ چشمک
رہی جس کی بنا پر ٹیم میں مجھے کبھی شریک نہیں کیا گیا، مگر ویسے درجنوں میچوں

میں جھگڑا میں نے کیا، آوٹ اور ناٹ آوٹ کے قضیوں میں ہمیشہ پیش از پیش رہا۔ کالج میں پہنچ کر وزیر علی اور نذیر علی کا کلاس فیلو رہا۔ سینکڑوں میچ دیکھ ڈالے، رن گن ڈالے، امپائروں کی غلطیاں نکالیں، ولایتی بلّوں میں خرابیاں نکالیں، بلکہ ایک تو چرا لیا، علیگڈھ میں جب ایم سی، سی والے آئے تو گلیگن کو مرتسر اور ٹینٹ کے سامنے ایک میچ کا چیلنج دیا اور اگر وہ منظور کر لیتے تو اپنی شکست کو عمر بھر نہ بھولتے، قصہ مختصر کرکٹ کی فضا میں رہا۔ بڑھا، اور پلا اور محض اپنی جدت سے کرکٹ میں وہ ترکیب دریافت کی جس سے میچ ہارنے کا امکان ہی جاتا رہا ایک نہیں اسی ترکیب سے دس میچ کھیلے اور جیتے ہیں۔ خود ہم نے!

——— :۲: ———

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جب ہم اسکول میں پڑھتے تھے تو ہمارے کپتان صاحب دوڑ دھوپ کر کے مل ملا کر کسی نہ کسی طرح ایک میچ گوروں سے طے کر آئے یہ گورے تو ویسے میچ کے بھوکے ہوتے ہیں، اس میچ میں کپتان صاحب نے نہ تو ہمیں کھلاڑیوں میں شامل کیا اور نہ "مدفاضل" میں رکھا جو ہر جگہ گھس گھس کر میچ دیکھتے، رن گنتے بلّے تولتے، یا اور طرح خصوصیت جتاتے اور ریفرشمنٹ کے انتظامات میں بھی پیش از پیش رہتے، گوروں کی فوج کی طرف سے میچ کا خاصا انتظام تھا، حد یہ کہ ایک خیمہ میں ریفرشمنٹ کے بہانہ سے نہ معلوم

کیا کیا یار لوگ "ریشم" اور "کلابتون" اڑایا کئے اور ہم "ناتوان" دیکھا کئے! یعنی ہم اور ہمارے دوست واقعی دور ہی سے معمولی میچ دیکھنے والوں کی طرح میچ کو سچ مچ "دیکھتے" ہی رہ گئے، نتیجہ ہمارے اسکول کی ہار رہی، بُری طرح ہارے، دوڑتے دوڑتے اور "پڑتے پڑتے" سویرا ہوگیا، کھلاڑیوں کا گوروں نے نشار نکالدیا، ایک سے ایک تگڑا وہاں گورا موجود، ایسا کہ ادھر گیند پہنچی نہیں کہ اس نے "بنٹی" کردی، قصہ مختصر لڑکوں کو رپٹا مارا، جتنا کھلایا تھا سب وصول کرلیا، پھر عنایت ہی سمجھئے جو گوروں نے بخش دیا، کیونکہ ان کے رن اتنے ہوگئے تھے کہ آگے کھیل کی ضرورت ہی نہ رہی، کئی وکٹ اور بہت سے رنوں سے اسکول کی ٹیم ہاری۔

میچ کا انتظام، ریفرشمنٹ وغیرہ کا انتظام ایسا نہ تھا کہ اُس کی دلکش اور سہانی یاد کسی نیک اور پاک دل طالب علم کے معصوم دل سے محو ہو سکے، چنانچہ ہمیں بھی فکر پڑا کہ کسی طرح ان گوروں سے میچ طے کریں۔

چنانچہ ہم اس تاک میں تھے کہ ایک روز اسی رجمنٹ کا گورا ہمارے بنگلہ کی طرف نکل آیا، یہ رجمنٹ ہائلینڈرس کا تھا، اس گورے کے ساتھ ایک کُتا تھا اور ہمارے یہاں بلامبالغہ اچھے سے اچھے کُتے موجود تھے، اور کتّوں کے ڈاکٹر اور قدردان نہیں بلکہ عاشق زار بھائی صاحب بھی موجود، کچھ تو کُتا پسند اور کچھ گورا پسند لہذا فوراً گورے صاحب کو روکنے کا بہانہ ہاتھ آیا۔ نتیجہ یہ کہ بہت

جلد قبلہ گورے صاحب بنگلہ کے مختصر لان پر بیٹھے کتّوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے یہاں اپنا یہ حال کہ باتیں تو کتوں کی ہو رہی ہیں مگر جی ہے کہ پڑا ہے میچ کے ریفر شمنٹ میں گورے صاحب کو کرکٹ کے ڈول پر لانا چاہا تو معلوم ہوُا وہ کرکٹ کے قطعی شوقین نہیں، سوڈا برف سے ان کی خاطر خواہ مدارات کی ان کے یہاں کُتّے دیکھنے آنے کا وعدہ کیا، اور یہ بھی بر سبیل تذکرہ عرض کر دیا، کہ میچ کا معاملہ بھی وہیں طے کر لیں گے۔

دو چار روز بعد رجمنٹ میں جو پہنچے تو پایا تو اس بیہودہ گورے کا ہم نام بھول گئے یا دس بیس گورے اسی نام کے اَور موجود تھے، پتہ لگا کر پہنچے جو سہی تو اسی نام کا ایک سخت بدتمیز گورا ملا، جو ہمیں دیکھتے ہی آنکھیں مٹکانے لگا۔ اور اُنگلیاں نچانے لگا اور اس کے ساتھی لگے قہقہہ اُڑانے۔ پھر آگے ہمت نہ پڑی جو اُس منحوس کی تلاش کے سلسلہ میں کسی اور بھی "خراب" گورے سے ملتے، چنانچہ سوچے کہ میچ طے کر لیں۔

باضابطہ ٹائپ شدہ چیلنج ایک فرضی کلب کے کپتان کی طرف سے لائے تھے کسی رجمنٹ سے میچ طے کرنا معمولی بات نہیں۔ گھنٹوں ادھر سے اُدھر دوڑے، درجنوں افسروں اور نہ معلوم کن کن سے ملے اور نتیجہ یہ کہ جواب باصواب نہ ملا، خط پر پتہ چھوڑ کر آئے کہ اس پتہ پر ہم مطلع ہوں۔

بات گئی گذری سی ہو گئی تھی کہ دس پندرہ دن بعد ایک اطلاعنامہ

آیا کہ ہم فلاں دن میچ کے لئے تیار ہیں، فوراً ہم پھر رجمنٹ پہنچے اور میچ منظور
کر لیا۔ ایک شرط پر۔ وہ یہ کہ کھیل کا سامان ہماری دوسری ٹیم اسی روز ایک
اور جگہ لے جائے گی، لہٰذا سامان وغیرہ آپ کا ہی رہیگا، دراصل یہاں یہ
حال تھا کہ ٹوٹا بلا چھوڑ "اسکورنگ" پنسل تک نہ تھی، گوروں کے یہاں قاعدہ
ہے کہ روز تو وہاں قواعد پریڈ اور اسی قسم کے فضول دہندے رہتے ہیں۔ میچ
کے لئے خاص طور پر دن نکالا جاتا ہے ساری رجمنٹ کی چھٹی ہو جاتی ہے
چنانچہ ہم سے پابندی وقت پر پہنچنے کا بھی اشارہ کر دیا گیا تھا، یہ معاملہ طے
کر کے جو ہم آئے ہیں تو یار دوست مارے خوشی کے دیوانے ہو گئے ناچنے
لگے اور یہ حال کہ تمام کے تمام دوست میچ کھیلنے کو تیار! ایسے ایسے اناڑی
کہ گیند پھینکنے سے پیشتر ہی آوٹ ہو جائیں، بڑی مشکل سے ہم نے انتخاب
کیا اور گہری دوستی ہی کو مجبوراً معیار قرار دیا، ایک صاحب کو محض اس وجہ
سے رکھنا پڑا کہ انہوں نے اپنے دو سوٹ دوسرے کھلاڑیوں کو دینے کا وعدہ
کیا، دراصل یہ بے حد ضروری تھا کہ ہم ٹھاٹ سے جائیں، ایک موٹر کرایہ کیا
اور اتنے قبل از وقت ہم وہاں پہنچے ہیں کہ سوائے مزدوروں اور خلاصیوں کے
کوئی بھی نہ تھا، موٹر پر آنا بیکار گیا، اس دوران میں سب آپس میں پرتھوی
راج کی فوج کی طرح ایک دوسرے سے عہد و پیمان کرتے رہے کہ بیحد اچھا
کھیلیں گے جب تک جان ہے اور بلّا ہاتھ میں ہے گیند کو وکٹ

کے قریب بھی نہ جانے دینگے، خواہ کتنے ہی زور سے گیند آتی ہوگی، ہر گز ہر گز "گریز"، نہ چھوڑیں گے دراصل دو تین ایسے ہی تھے اُن سے قسمیں لیں۔

—————— : ۳ : ——————

بہت جلد خدائے عز وجل نے مہربانی کی اور میدان بھر گیا، سینکڑوں گورے بقول کسے "گورے پہ گورا" اور میمیں اور اِدھر اُدھر کے لوگ آ جمع ہوئے، پہلے کا سا مجمع ہو گیا اور انتظام وہ زوردار کہ ریفرشمنٹ کے خیمہ کی طرف دیکھ کر ہم لوگ آپس میں جب آنکھ کا اشارہ کر کے مُسکراتے تو اندر سے دل کھنچنے لگتا، کھانا بھی کون منحوس کھا کر آیا، کسی نے کہا کہ بھیّا میں تو دو بسکٹ کھا کر آیا ہوں، کوئی روٹی کا ایک ٹکڑا کھا کر اوپر سے بہت سا پانی پی کر آیا تھا میں نے خود صرف ایک انڈے پر اکتفا کی تھی۔ یہ سوچ کر کہ وہ ڈٹ کر کھایا ہو کہ یاد کریں گورے بھی کہ آئی تھی کوئی ٹیم کرکٹ کھیلنے۔ میچ تھا گوروں سے کوئی مذاق!

ہم آپ سے صحیح عرض کرتے ہیں کہ سہم ہی تو گئے، جب گوروں کے کپتان نے کہا کہ، "ٹاس"! گویا یہ طے ہو کہ کون پہلے کھیلے، ہم نے کہا کہ جیسا ہم پہلے عرض کر چکے ہیں عموماً ہم دو میچ کھیلتے ہیں، اس میچ میں ہم پہلے کھیل لیں اور دوسرے میچ میں آپ پہلے کھیل لیجئے گا، ایک گورے نے چون و چرا کی تو ہم نے کہا کہ: "صاحب ہم لوگ آخر کو ہندوستانی اور وہمی آدمی ہیں، شگون اور استخارہ سے کام چلاتے ہیں اگر اس کے خلاف ہُوا تو اپنے عقیدہ کے بموجب نہ صرف

ہم ہار جائیں گے بلکہ اور کسی افتاد سے سابقہ پڑیگا۔" شگون اور استخارہ کے پاکیزہ اصول جب ان بیوقوف گوروں کو سمجھائے تو وہ بہت ہنسے اور راضی ہو گئے۔

جلدی جلدی اور چپکے چپکے میں نے کھلاڑیوں کو قسمیں دے دے کر تاکید کی کہ دیکھو گڑبڑ نہ ہونے پائے، ڈر نا مت، ڈٹ کے کھیلنا وغیرہ وغیرہ۔

ہمارے دو گھٹیا قسم کے کھلاڑی بلا لیکر میدان میں تالیوں کی گونج میں اُترے۔ یہ دونوں دیکھنے میں بڑے عمدہ کھلاڑی معلوم ہوتے تھے، مگر اصلیت یہ تھی کہ گلی ڈنڈے سے آگے کچھ نہ جانتے تھے تیار ہو کر کھڑے ہوئے۔ اُدھر سے گیند جو آئی تو ان کا وعدہ تھا کہ بالکل نہ ڈروں گا، چنانچہ وعدہ پورا کیا انہوں نے۔ وہ کس کر ہٹ لگایا کہ اگر گیند پر بلا پڑ جاتا تو تارا ہو جاتی، مگر وہ تو کمبخت وکٹ اُڑا لے گئی، انہیں پہلے ہی سے سکھا دیا گیا تھا، اور باوجود آؤٹ ہونے کے یہ جگہ سے نہ ہٹے، پوچھا تو کہنے لگے یہ تو "ٹرائی بال" بھی گورے فوراً راضی ہو گئے مگر یہ حضرت تیسری گیند پر آؤٹ ہو گئے۔ دو خالی نکل گئیں۔

چوتھا شخص جو ہمارا پہنچا ہے تو اس نے گوروں کو پریشان کر دیا، اچھا کھلاڑی تھا، ساتھی بھی اچھا ملا، چوطرفہ ہٹ لگائے اور کسی طرح گوروں کے قبضہ میں نہ آیا تا وقتیکہ اس نے چونتیس رن نہ کر لئے، کُل ملا کر ہمارے رن قریب پچاس کے پہنچے تھے کہ یہ خاکی پتلا اُٹھا، یار لوگوں کو سکھا دیا تھا، ٹیم کا کپتان

تھا مذاق ؟ خوب چیرز دئے گئے، اور میں اس ٹھاٹھ سے "کریز" پر پہنچا ہوں کہ بس
دیکھا ہی کیجئے، پہنچتے ہی اول تو میں نے چاروں طرف ایسے نظر دوڑائی گویا یہ دیکھ
رہا ہوں کہ کس گورے کو زیادہ دوڑانا چاہیئے، دیکھ بھال کے بعد میں نے کریز
ناپی، اس کے بعد اُن کے امپائر سے بڑی شان کے ساتھ سنٹر مانگا، اپنے
امپائر کو بھی آنکھ ماردی، آدمی سکھایا پڑھایا اور بہت پیشتر سے عقلمند تھا!
وہ بھی پہنچا اور انتظام میں شریک ہوکر اس نے سائنٹیفک طریقہ پر غلطی
نکال کر نئے سنٹر کی تصدیق کی، اور وہ بھی اتنی جانچ پرتال کے بعد کہ غالباً لوگ
تنگ آ گئے ہونگے، اس کے بعد رومال جو میں "پیویلیں" میں قصداً چھوڑ آیا
تھا وہ مانگا، فوراً ایک سدھایا ہوا ساتھی بگٹٹ لئے دوڑ آیا، اب جو دیکھتا
ہوں تو سامنے گوروں کا خطرناک "بولر" ایک گٹھا ہوا، انتہا سے زیادہ سرخ
اور سخت مضبوط، خود گیند کی طرح گول مٹول گورا تھا، جو اس زور سے بھنّا کر
گیند پھینکتا تھا کہ معلوم ہو میکسم گن کا گولا ہے کہ چلا آرہا ہے! میں نے اس
بدتمیز کو دیکھا کہ چلا وہ اُدھر سے گیند لے کر اور ادھر قبل اسکے کہ اس کے ہاتھ
سے گیند چھوٹے میں "نات ریڈی" کہہ کر کریز کو چھوڑ کر پرے ہٹ گیا، گیند
بیچ کا وکٹ اُڑائے چلی گئی، میں نے معذرت کی۔ کچھ نہیں ایسا بھی ہوتا ہے
میں نے اس سے گیند کی رفتار بھی معلوم کرلی، اب میں یہ سوچ رہا تھا۔ کہ
اگر کہیں لگ گئی یہ گیند میرے سر پر تب کیا ہوگا۔ دل نے کہا کہ بھیّا مرزا

کھیل گیا چوکھے ہیں، یہ بلّا جو خدا نے تمہیں اس وقت عنایت کیا ہے، اِسے غنیمت سمجھو۔ یہ لکڑی کے بیجان وکٹوں کی کوری اور بیکار حفاظت کے لئے نہیں ہے بلکہ دراصل حملہ سے اپنا سر بچانے کے لئے ہے۔ اب رہ گئے وکٹ! تو ان کے بچانے کی فکر ہیں جو تم بھول کر بھی پڑے تو یاد رکھو خیر نہیں، ایسا نہ ہو کہ سر کو بھول جاؤ! یہ گیند نہیں گولا ہے! جسے ایک موذی پھینک رہا ہے سب کپتانی دھری رہ جائیگی، جو چھوٹ گیا سر، تو ریفرشمنٹ کے خیمہ کے بجائے یہی نامعقول گورے تمہیں خالی پیٹ ملٹری ہسپتال نہ پہنچادیں تو ہمارا ذمہ، اور پھر کیک پیسٹری کے بجائے صرف کھاری سوڈا ہاتھ آئیگا۔

چنانچہ ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے بادل ناخواستہ گیند پھینکنے کی اجازت دی، دل دھڑکنے لگا، وہ منہ بنا کر اور بدن کو جھٹکا دیکر وہ کمبخت لپکا ہے کہ گیند تو اس کے ہاتھ سے چھوٹتے نظر آئی۔ میں نے کچکچا کر بلّا مضبوط پکڑ لیا تھا، اور اُٹھا کر ہٹ لگانے کے امکان پر غور کرنے ہی کو تھا کہ "کھٹکا" ہوا، میں چونک پڑا! آوٹ ہو گیا! مگر نہیں گیند بلّے پر پڑی تھی اپنی جگہ سے ہٹا ہی نہ تھا، لوگوں نے نعرہائے تحسین بلند کئے "ویل پلیڈ"، "ویل ڈن" "ویل ججڈ" ان معقول آوازوں کے ساتھ ہی "اوور" ختم ہو گیا، اب دوسرے کھلاڑی کی باری تھی، ان کا ویسے ہی دم سوکھ رہا تھا، ادھر میں نے ان سے کہا "اسٹڈی"، اُدھر تڑسے وکٹ ان کا غائب۔

نیا کھلاڑی آیا، اس نے بھگتان، بھگتا ہی تھا کہ پھر میرا نمبر آیا، میں نے
دل میں کہا کہ اگر یہ "اوور" کھیل لئے خیریت سے تو پھر ایک سرے سے کرکٹ
ہی کھیلنا کم کر دینگے، اُدھر بولر جھومتا چلا اور ادھر میں نے دل میں سوچا کہ گیند
یا تو میری طرف آئیگی، اور یا وکٹوں کی طرف، اگر میری طرف آئی تو وکٹ محفوظ، اور
میرے ہاتھ میں جان بچانے کی وہ شئے بھی تو موجود ہے جسے عرف عام میں
بلا کہتے ہیں بالفرض اگر ہٹ نہ لگا تو کیا ہے گیند بھی تو نہ لگے گی۔ بس یہ دیکھنا
ہے کہ گیند خود اپنی طرف تو نہیں آرہی ہے اور یہی دراصل کرکٹ کا گُر ہے چنانچہ
یہ سوچ کر میں تیار ہو گیا۔ اُدھر سے گیند جو آئی دندناتی ہوئی تو صحیح عرض
کرتا ہوں کہ جس وقت بولر کے ہاتھ سے چھوٹی ہے میرا قطعی ارادہ کہ اس پر
باؤنڈری لگاؤں گا کیونکہ وہ وکٹ کی طرف آرہی تھی، مگر جب تک گیند آدھی
مسافت طے کرے میں "چوٹ پھینٹ" کے امکان پر غور کر چکا تھا، وکٹوں
کی طرف! ...... میری طرف! ...... وکٹ محفوظ! مگر نہیں وہ تو دونوں
طرف آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ وکٹ گئے چولہے میں، کوئی چارہ کار نہ تھا سوائے
اسکے کہ استغفار پڑھ کر آنکھ میچ کے بلّے کی ڈھال بناتے ہوئے جگہ سے
"نو بال" کہہ کر اچھل کے دُور گردں، اس کارروائی میں بلّے کی جگہ میرے پیر
نے لی اور اس پر زور سے گیند لگی اور اُدھر میں "نو بال" کہہ کر پھاند چکا تھا، سکھایا
پڑھایا امپائر اپنا تھا دونوں طرف سے اپیل ہوئی، ہماری طرف والے بولے

"ناٹ آؤٹ" امپائر بھی بول اُٹھا "ناٹ آؤٹ"، گورے بھنّا کر رہ گئے۔ قاعدہ اچھا ہے جو امپائر کہے وہ سچ اور ہم نے تو اپنے امپائر سے کہدیا تھا۔ اگر تمہاری وہاں کسی نے کرکری کی تو حسب دستور جھگڑا کر کے میچ بند کر دینگے، اب دوسری گیند جو آئی تو میری ہمت قلا بازی کھا رہی تھی، آنکھ میچ کے یا علی کہہ کر جو ہٹ بڑھ کر دیا تو بلاّ ٹھالی اور گیند شانہ کو چاٹتی ہوئی ٹوپی اُڑا لے گئی۔ میں پھر چیخا "نو بال" مگر کچھ فائدہ نہ ہُوا، اب سوائے جان پر کھیل جانے کے چارہ نہ تھا، اس کے بعد پھر جو گیند آئی تو کیا عرض کروں، جانچ تول کر ہٹ بھی لگایا، نشانہ بھی صحیح بیٹھا مگر وکٹ غائب، بس یہ معلوم ہو کہ ٹینس کا بغیر تانت کا بلاّ تھا جو گیند اس میں سے نکل گئی، پورے بیس منٹ کرکٹ کھیل کر بغیر ہٹ لگائے، یا رن کئے ہُوئے چلے آ رہے ہیں۔

میرے بعد پھر جو باقی بچے وہ بہت بُرا کھیلے، ڈر کے مارے کریز پر پھاند پھاند پڑے اِدھر اُدھر کی جاتی گیندوں کو مردانہ وار ران اور پشت پر لیا اور جو سیدھی آئی وکٹ لئے چلی گئی کل ہمارے ساٹھ ستر رن کے قریب ہُوئے اور سب آؤٹ۔ ہم بھی اس حماقت سے چھُٹی پا کر سوچے کہ چلو خوب ہُوا، اب اصل کھیل تو شروع ہو گا، ریفرشمنٹ والا، اب دیکھیں یہاں کون کون ہٹ اور باؤنڈری لگاتا ہے۔

—— : ۳ : ——

ناشتہ کی میزوں پر گھمسان کا معرکہ رہا۔ گورے خود بے تکلف اور ہم سب بے تکلف اور مزید برآں بھوکے، الم غلم جو سامنے آیا پار کیا، بعض چیزیں تو اس گڑبڑ اور دوا دوش کے عالم میں کھائیں کہ نمک ڈالنا بھول گئے۔ اور بعض کا ذائقہ یاد نہ رہا۔ دل کو سمجھا لیا کہ بھئی انگریزی کھانے پھیکے میٹھے تو ہوتے ہی ہیں، میں خود پورا ایک کیک کھا گیا گوروں نے بمشکل فی کس اتنا کھایا ہوگا کہ اسکا چوگنا ہمارے یہاں اس شخص نے کھایا جس نے سب سے کم کھایا، اس پر چائے، اور کس کس کر پانی، پان کے بجائے نارنگیاں، غرض وہ ڈٹ کے کھایا کہ اب پانی جو پیتے ہیں تو جی یہی چاہا کہ اب "باقی پھر" مگر نہیں، ہمیں تو میچ کھیلنا اور "جیتنا" تھا۔

عرض ہے کہ یہ خاکسار وکٹ کیپری میں قدرے ماہر ہے، لہٰذا جب گوروں کے کھیلنے کی باری آئی، تو ان فرائض کا بار گراں اپنے ہی کندھوں پر رکھا اپنے کھلاڑیوں کو قرینہ سے کھڑا کیا، کسی کو خواہ مخواہ "ذرا سا اِدھر ہٹایا، کسی کو اُدھر ہٹایا کسی کی جگہ بدلی، اسکے بعد بندہ نہایت ہی ہوشیاری سے بڑی شان کے ساتھ اپنے اہم فرائض کی ادائی میں مصروف ہو گیا۔

ہماری طرف سے پہلی ہی گیند آئی ہے کہ غدر مچ گیا، گورے نے کس کر ہٹ لگایا، ہٹ اچھا پڑا اور بڑا عمدہ "سلپ" نکلا، ایسا کہ گیند اُٹھ گئی۔ اور سیدھی ہمارے ایک ہوشیار کھلاڑی کے سینہ کی طرف ایک بہترین "کیچ" کا

امکان لئے ہوئے آئی مگر کھلاڑی ایک ہوشیار ٹھہرا۔ صاف بچ گیا۔ سر پر
ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ اور گیند اوپر سے نکل گئی، اور پرے گری۔ لپک کر ہمارے
ایک بہادر نے لی، گورا رن کر رہا تھا، لہٰذا انہوں نے بڑے زور سے وکٹ
کیپر یعنی میری طرف پھینکی تاکہ میں وکٹ میں مار دوں اب میرے پاس جو گیند
آئی تو اول تو بہت ہی قریب سے پھینکی گئی تھی اور پھر اس زور سے پھینکی تھی
کہ الاماں لہٰذا قصداً اور غیر قصداً گیند مجھ سے نکل گئی، اور میں اپنی ڈیوٹی
چھوڑ چھاڑ ایک نعرہ مار کر گیند کے پیچھے! مگر مجھ سے پہلے ایک اور ہمارے
کھلاڑی نے اٹھالی اور زور سے جو وکٹوں کی طرف پھینکی یا ماری ہے تو وہ گولی
کی طرح وکٹوں سے کچھ فاصلے سے ہو کر نکلی چلی گئی۔ وہاں روکتا کون۔ میں تو یہاں
تھا، اب میں پھر لوٹا اور بجائے وکٹوں پر رکنے کے گیند کی طرف دوڑا، وہاں
گیند دور پہنچی تھی۔ ایک صاحب نے اٹھا کر مجھے دی۔ میں نے دیکھا کہ میری
جگہ ایک اور ہمارے کھلاڑی آگئے ہیں اور گیند کے منتظر ہیں کہ پہنچے تو وکٹوں
کو گرادیں، لہٰذا میں نے اپنی پوری قوت سے گیند ان کی طرف پھینکی، انہوں
نے ویسے تو بڑی تیاری کی تھی لیکن جب گیند قریب آئی تو آدمی یہ بھی سمجھ دار
تھے صفا اپنے پیر بچانے کے لئے اچھل گئے۔ اور پھر گیند نکلی چلی گئی، اور
اس درمیان میں گورے ہیں کہ کر رہے ہیں زنا زن، رن پہ رن! میں پھر گیند
کی طرف لپکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہمارے دو کھلاڑیوں کے درمیان سے

گیند نکل گئی ہے ایک نے اپنی ہی جگہ تڑپ کر کہا "امان لینا . . . . . دوسرے نے کہا "چہ خوش ! اپنی بلا میرے سر، خود کیوں نہیں دوڑتے" جب میں نے یہ دیکھا تو میں خود دوڑا، بمصداق سب کا آقا سب سے کمتر، ہم ہی تو ٹیم کے کپتان تھے، عزت ہمارے ہاتھ تھی، دوڑ کر گیند کو پکڑا ورنہ باؤنڈری ہو جاتی، مگر اب گھوم کر جو دیکھتے ہیں تو گوروں نے رن کرنا بند کر دئے ہیں، کوئی بیس بائیس رن تو ہو چکے تھے اور اگر وہ کئے جاتے تو دس بارہ اور ہو جاتے جب میں نے یہ دیکھا تو گیند ہاتھ ہی میں لئے لپکتا آیا، دونوں کھلاڑی اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر میری طرف آ گئے تھے تیوری پر ان کے بل تھے۔ ایک گورے نے بڑھ کر مجھ سے کہا "دہاٹس اِٹ کپتان" بجائے جواب کے میں نے گیند کو وکٹ پر چھواتے ہوئے امپائر سے پوچھا "ہاؤزٹ امپائر" ہمارا امپائر بولا "آؤٹ" اس پر پویلین سے ایک شور سا ہوا، ہم خود قاعدہ قانون سے واقف اگر تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے کہ ہم قصداً رن بنانے کا غنیم کو موقع دے رہے تھے تو اس کے یہ معنی تو نہیں کہ رن کرنے والے رن کرتے کرتے نہ صرف رک جائیں بلکہ اِدھر اُدھر افیونیوں کی طرح گھومنے لگیں تو ان کے امپائر سے ہم نے کہلوا لیا کہ کھلاڑی آؤٹ ہو گیا، بحث اور حجت تک نوبت پہنچی، ہم نے بھی کہا کہ صاحب ہم بہترین فیلڈنگ کر رہے ہیں آپ رن کئے جائیے آپ کو ہماری فیلڈنگ سے کیا بحث۔ چاہے ہم زیادہ رن بنوا دیں یا تھوڑے آپ

کون ؟ آپ کورن کرنے سے مطلب ۔ چنانچہ اب جو گورے صاحبان کھیلنے کھڑے ہوئے ہیں تو ہماری فیلڈنگ کا رنگ ہی اور تھا، وہ کھلاڑی جو ''ہٹ'' پر تھا جیب میں تاش لایا تھا اور کنارے بیٹھا ''باؤنڈری مین'' کے ساتھ ''چانس'' کھیل رہا تھا، جو کھلاڑی ''آف'' پر تھا وہ ہاتھ نچا نچا کر گنگنا رہا تھا ''موٹر کا پہیہ تیز سیاں ہم نہیں بیٹھیں گے ! . . . . موٹر کا . . . .'' لانگ وکٹ کیپر'' بیٹھا ہوا تھا، پوچھا کیوں، تو بولا، ہم اِدھر سے گیند ہرگز نہ جانے دینگے، تمہاری بلا سے بیٹھیں یا لیٹیں ۔ باقی جوان سے زیادہ مستعد تھے وہ بجائے علیحدہ علیحدہ کھڑے ہونے کے باتیں کرنے کے لئے دو دو اکٹھے کھڑے تھے یا لیٹے تھے ۔ کچھ مونگ پھلیاں ٹھونگ رہے تھے، کھا اتنا لیا تھا کہ چلنا مشکل تھا، فیلڈ کی یہ حالت اور ادھر ہمارا بولر بار بار کھلاڑیوں کو پکار کر کہہ رہا تھا کہ ''ریڈی پلیز'' اور ادھر میں بھی اپنے ''ٹڈ گارڈ'' ٹانگوں پر چڑھائے ''یس . . . . یس . . . . . .'' کہہ رہا تھا اور اُدھر گورے صاحبان بجائے کھیل کے حجت اور بحث پر آمادہ ! آگ بگولا ہو کر مجھ سے گورے نے کہا: تمہارا اس سے کیا مطلب ہے ؟'' اور ہمارے دو مستعد کھلاڑیوں کی طرف انگلی اُٹھائی جو اس وقت بڑی تندہی سے پنجہ لڑا رہے تھے، میں نے جواب دیا کہ ہمارے کھلاڑی دراصل اپنی ذمہ داری خوب سمجھتے ہیں، آپ کو تکلیف کی کوئی ضرورت نہیں ہماری ٹیم ایک جگہ نہیں سینکڑوں جگہ سے جیت کر آئی

ہے، قصہ مختصر میں نے اور ہمارے بولر نے تقاضا کر کے گورے کو راضی کیا ہمارے بولر نے قصداً گیندیں بچا بچا کر دینی شروع کیں ایسی کہ گورے کے پیچھے سے نکلی چلی جائے، کچھ بحث نہیں کہ نو بال ہے، یا کیسی. چوتھی گیند گورے نے بڑھ کر کس کر ٹھونک دی اور اسی پر ہم میچ جیت گئے۔

گیند میں ہٹ جو لگا اور میں نے جو کہا ہے کہ "لینا" نواب ہمارے کھلاڑیوں کی مستعدی ملاحظہ کیجئے کہ جو جہاں تھا وہیں سے دوڑ پڑا! گیند کی طرف! اور وہ بھی اس قدر بے تحاشا کہ بس دیکھا ہی کیجئے، مگر گیند چونکہ آگے جا چکی تھی اور دوڑنے والوں نے قدرے دوسری سمت اختیار کی، لہٰذا بہت جلد وہاں سے لوگ پکارے "ہمیں نہیں ملتی"! اور پھر فوراً یہ روح فرسا پیام آیا کہ "کھو گئی" انا للہ وانا الیہ راجعون - یہ سُن کر ہمارے بولر نے نعرہ مارا.... "کھو گئی . . . . . . دوسری گلی میرا داؤں" اب گوروں کی حماقت ملاحظہ ہو کہ رن نہیں کرتے، میں نے ہاتھ جھٹک کر ترغیب دی "گو آن سر...... رن آن" پیویلین سے قہقہے بلند ہوئے اور سینکڑوں آدمی چلّائے "رن آن" "رن آن" مگر توبہ کیجئے گڑبڑ ہو گئی تمام لوگ پیویلین پر سے اُتر پڑے، ان میں سے کچھ غصہ تھے لیکن باقی ہنس رہے تھے، مگر خود کھلاڑی گورے آگ بگولا ہو رہے تھے سوائے دو تین کھلاڑیوں کے جو میری پیٹھ ٹھونک کر کہنے لگے "ویل بلیڈ کپتان" اور میں حجت کر رہا تھا کہ آپ لوگ کیوں کھیل بند کئے دیتے ہیں، ہمارے سب

کھلاڑی آن موجود ہوئے، بحث شروع ہوگئی، جن دو گوروں نے رن کئے تھے ان کا میمیں اور لڑکیاں اتنا مذاق اُڑا رہی تھیں کہ خود اپنی حماقت پر انہیں ہنسی آنے لگی، بہتیرا ہم نے کہا کہ کھیلو مگر گورے نہ مانے۔ جب کسی طرح راضی نہ ہوئے تو ہم نے امپائر سے "رول مانگا" نتیجہ یہ کہ ہم قریب پچاس ساٹھ رن سے جیتے اور بوجہ فریق مخالف کے نہ کھیلنے سے میچ ختم ہو گیا۔

اس کامیاب میچ کے بعد ہم نے کانپور میں دو تین اسی طرح کے میچ کھیل ڈالے حتیٰ کہ ایک میچ میں زد و کوب تک کی نوبت پہنچی، پھر تو یہ دستور ہو گیا کہ جو بھی ٹاس جیتا وہ میچ بھی جیت گیا۔ پھر جب علیگڈھ میں ایم سی سی کا میچ ہوا تو نہ صرف ایک ٹیم تیار کر لی تھی بلکہ ہماری ٹیم کے سرپرست اعلیٰ اور دوسرے احباب ایک ہزار تک روپیہ بھی ایم، سی، سی، کو دینے کو تیار تھے اور میں اس سلسلہ میں بہت کچھ دوڑا دھوپا، مگر گلیگن نے وقت کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے انکار کر دیا ورنہ ہم صحیح عرض کرتے ہیں کہ اس میدان پر ان کو شکست دیتے جس جگہ انہوں نے ہماری یونیورسٹی کو شکست دی تھی۔

شادی کی ضرورت

یہ ڈراما، دہلی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن ——— سے براڈ کاسٹ کیا گیا

افراد ڈرامہ

عزیز ——— ایک لاپرواہ، بے کار، بگڑا ہوا نوجوان

انور ——— عزیز کا ایک غریب دوست

چندولال ——— محلے کے بزرگ، سب کو نصیحت کرنیوالے

اعجاز علی ——— ایک رئیس زادہ جو اپنی بہن کی شادی کا اشتہار دیتا ہے اور عزیز کو اپنی بہن کیلئے منتخب کرتا ہے

نسیم ——— اعجاز علی کا دوست

منصور ——— عزیز کا ایک نامعلوم رقیب

چپراسی، خانساماں دوسرے آدمی وغیرہ

پہلا سین

افرادِ سین :۔ عزیز (۲) انور (۳) چندولال چچا۔

مرقع :- عزیز اپنے باہر کے مکان میں آرام کرسی پر مزہ سے لیٹا حقہ پی رہا ہے۔ کہ اس کا دوست انور داخل ہوتا ہے۔

انور- (کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے) السّلام علیکم۔

عزیز- (اُٹھتے ہُوئے) آآ...... خ چوں ...... آئیے آئیے وعلیکم السلام وعلیکم السّلام۔ وعلیکم السّلام،

انور- واللہ۔ کیا کہنا۔ آجکل تو زوروں پر ہو۔ مارے خوشی کے پھوٹے جا رہے ہو۔ کچھ تو بتاؤ۔ یہ آنکھوں میں پریاں کیسی ناچ رہی ہیں؟

عزیز- بس کچھ نہ پوچھو۔ راوی چین لکھتا ہے۔

انور- پھر بھی کچھ تو بتاؤ،

عزیز- بتائیں کیا۔ بس جورو کی دھن ہے۔ بیوی کا خوشگوار اور نرم تخیل دماغ پر ہر دم چھایا رہتا ہے۔ گھر میں چاروں طرف ایک دلربا بیوی کا سایہ چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ اسی خیال میں ڈوب کر رہ جاتا ہوں اور بیوی کی دلچسپ مٹھاس سے سارا گھر رچا اور بسا معلوم ہوتا ہے، آنکھیں نیم باز کئے ...... دنیا ایک پرفسوں خواب معلوم ہوتی ہے، سوتے جاگتے کا سا عالم رہتا ہے اور گھر ایک گہوارہ کی سی جنبش لیتا معلوم ہوتا ہے۔ ارے یار حد ہوگئی مُرغیاں بیویوں کی ٹہلتی نظر آتی ہیں۔ اور مُرغوں پر خود کا خوشگوار دھوکا ہوتا ہے۔ اور......"

الور۔ (قہقہہ لگاتے ہوئے) واللہ کیا کہنا ہے۔

عزیز۔ (بات کاٹ کر) بس بس یہ سمجھ لو کہ عالم کائنات ۔ ۔ ۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک موٹی سی بیوی ہے۔

(دونوں قہقہہ لگاتے ہیں)

الور۔ مگر یار من! بات یہ ہے۔ کہ بیوی ملے کیسے۔ ویسے تو دن میں دس لیلو مگر بیوی جسے کہتے ہیں۔ اس کا ملنا مشکل ہے۔ کوئی سال بھر سے خود ہماری کوشش ہو رہی ہے۔ مگر بے کار۔ وہ بھی کیسی؟ ایسی کہ جو کہیں یورپ میں کرتے۔ تو زار روس ہو جاتے!

عزیز۔ اجی حضرت یہ بیوی ہے۔ مذاق نباشد۔ جانتے ہیں آپ بیوی اور بادشاہت میں کیا فرق ہے۔ وہ یہ کہ بادشاہت لڑنے سے ملتی ہے مگر خود نہیں لڑتی۔ مگر بیوی بغیر لڑے ملتی ہے۔ مگر خود خوب لڑتی ہے یہ تو تقدیر کا معاملہ ہے کوشش بے کار ہے۔ تمہاری تقدیر ہی کوٹلہ ہو تو کیا چارہ آخر بندہ خاں بھی تو ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایلو وہ آگئے۔ چچا چنڈول ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الٰہی خیر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(چچا چنڈو داخل ہوتے ہیں)

عزیز۔ آداب عرض ہے چچا،

الور۔ چچا سلام:

چندو۔ جیتے رہو بیٹا۔ جیتے رہو۔ بیٹھو بیٹھو کہو بیٹا کچھ نوکری چاکری کی فکر کی؛

عزیز۔ اجی لعنت بھیجئے نوکری پر؛

چندو۔ پھر وہی بدتمیزی۔ بے کاری بُری چیز ہے۔ اس انور کو دیکھو۔ دن رات تیلی کے بیل کی طرح نوکری میں جتا رہتا ہے۔ ایک تم ہو بے کار؛

عزیز۔ اپنی اپنی تقدیر ہے۔ بیل کی اور عربی گھوڑے کی تقدیر میں فرق ہوتا ہے؛

چندو۔ یاد رکھو عزیز برسر روزگار نہ ہو گے۔ تو گھاس کھودو گے؛

عزیز۔ آپ کا تو مطلب ہے۔ کہ انور کی طرح میں بھی تیس روپلی کی نوکری کروں۔ دراصل آپ یوں قائل نہ ہونگے۔ ذرا ٹھہریئے ابھی آیا۔

(چلا جاتا ہے)

چندو۔ نامعلوم اسے کیا ہو گیا؛

انور۔ آجکل شادی کا بھوت سوار ہے؛

چندو۔ نہ نوکر نہ چاکر ایسے بے روزگارے کو کون اپنی لڑکی دے دیگا؛

(عین اس موقع پر عزیز داخل ہوتا ہے۔ اور چندو چچا کا کہنا سُن کر کہتا ہے)

عزیز۔ میں بتاؤں کہ بے روزگارے کو کون لڑکی دے گا۔ یہ دیکھئے خطوں کا پلندہ۔ نوکری۔ نوکری۔ نوکری لگا رکھا ہے؛

انور۔ یہ کیسے خط ہیں؟

عزیز۔ دیکھتے جاؤ۔ پہلے یہ اخبار لو۔ میں پڑھتا ہوں۔ سنئے چچا۔ یہ دیکھئے

اشتہار ہے "ضرورت رشتہ۔ ایک روشن خیال نہایت ہی متمول گھرانے کی نوعمر اور خوبصورت لڑکی کے لئے رشتہ کی ضرورت ہے لڑکا ہونہار ہونا چاہیئے۔ برسرِ روزگار نہ ہو تو حرج نہیں خط و کتابت بہ صیغہ راز ذیل کے پتہ پر"

سُنا آپ نے چچا۔ ہوئے کچھ قائل۔ یہ جو آپ شادی کیلئے برسرِ روزگار ہونے کی ناخوشگوار شرط لگا کر محلہ کے زندہ دل نوجوانوں کا خون خشک کیا کرتے ہیں۔ کہاں تک درست ہے۔ دراصل یہ شرط نہایت بےکار اور جذبات کو پامال کرنے والی ہے!

چندو۔ کوئی احمق ہو گا اشتہار دینے والا۔ مگر پھر اس اشتہار سے آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟

عزیز۔ مطلب میرا یہ ہے کہ ابھی خط سُنئے۔ یہ خط لیجئے۔ دیکھئے یہ لکھا ہے میری تصویر دیکھی گئی۔ اس میں یہ لکھا ہے۔ کہ مجھے تعلیم جاری رکھنا پڑے گی۔ اور یہ لکھا ہے کہ سسرال میں گھر داماد بن کر رہنا ہو گا۔ اور یہ لیجئے تیسرا خط۔ دیکھئے اس میں لکھتے ہیں، کہ میری طرف کے بھی تمام اخراجاتِ شادی وہ خود برداشت کریں گے اور چپکے سے اس مقصد کے لئے پانچ ہزار روپیہ دینگے۔ تاکہ شادی کی خوب دھوم دھام ہو اور کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ لڑکی

غریب گھر میں دیدی۔ اور یہ دیکھئے خط۔ اس میں ۱۲ تاریخ کو مجھے بر دکھاوے کے لئے بلاتے ہیں تاکہ شادی کی تاریخ وغیرہ سب طے ہو جائے، میں نے اس کے جواب میں لکھ دیا تھا۔ کہ ضرور آؤں گا لیکن پھر اس کے بعد یہ خط کل ہی آیا۔ کہ وہ ضروری کام سے کہیں باہر چلے گئے اور اب صرف یہی صورت ہے۔ کہ میں ان سے ۱۷ تاریخ کو ٹونڈلہ اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں مل لوں ورنہ معاملہ دو ماہ تک ملتوی رہیگا۔ آج پندرہ تاریخ اور یہ آپ کا نالائق بھتیجا پرسوں ٹونڈلہ کے ویٹنگ روم میں اپنا بر دکھوا آئے گا۔ اب فرمائیے چچا کیا رائے ہے؟

انور۔ یار یہ خوب رہے تم؛

چندو۔ خدا مبارک کرے۔ مگر ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ یہ ہیں کون؟

عزیز۔ ہوتے کون۔ اعجاز علیخاں خود لڑکی کے بھائی ہیں باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ گھر کے رئیس ہیں؛

چندو۔ سوتیلی بہن ہوگی،

عزیز۔ جی نہیں۔ سگی بہن ہے،

چندو۔ تو پھر پاگل ہونگے۔

عزیز۔ کچھ بھی ہو۔ اب یہ بتلائیے کیا رائے ہے۔

چندو۔ بھیا میری رائے تو یہی ہے کہ اس شادی پر ڈالو دھول اور پانچ
پچیس کمانے کی فکر کرو۔ محنت کرو۔

عزیز۔ وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔

چندو۔ بیٹا تم جانو تمہارا کام۔ کہیں کسی وبال میں نہ پھنس جانا۔ اب میں
تو جاتا ہوں۔ خدا مبارک کرے۔ مگر ہم نے بھی دھوپ میں بال سفید
نہیں کئے ہیں۔ یہ اشتہار بازی اچھی نہیں، لو خدا حافظ؛

عزیز۔ آداب عرض چچا۔ آداب عرض؛

انور۔ آداب عرض ہے چچا؛

چندو۔ جیتے رہو۔ جیتے رہو۔ روزی میں ترقی ہو؛

(چلے جاتے ہیں)

عزیز۔ واللہ ان بڑے میاں نے تو ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ مگر نہ کہنا یار۔
میں نے بھی کیسا قائل کیا ہے۔ وہ مضمون ہوا بڑے میاں کا کہ جل
ٹھنڈے؛

انور۔ مگر یار تو نے بھی خوب ہاتھ مارا ہے۔ سب معاملہ طے ہو گیا۔

عزیز۔ اس میں کچھ شک بھی ہے۔؟

انور۔ مگر یہ تو بتاؤ۔ تم گھر دامادوں پر لعنت بھیجتے تھے شادی میں فضولخرچی
کے مخالف تھے۔

عزیز۔ بات دراصل یہ ہے۔ کہ اچھی بیوی کے لئے میں نے ان سنہری اصولوں کو چھوڑا!۔

انور۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ اعجاز علی خاں کو دیکھا تو ہے نہیں تم نے۔ آخر پہچانو گے کیسے؟

عزیز۔ میں نے ان کو نہیں دیکھا تو کیا ہے۔ انہوں نے اول تو میری تصویر دیکھی ہے۔ اور پھر ویٹنگ روم میں یا آس پاس میرے خود منتظر ہو گئے۔ میں ان کا متلاشی اور وہ میرے متلاشی۔

انور۔ خدا مبارک کرے۔ مگر یار ہو بڑی تقدیر والے خوب ہاتھ مارا!

عزیز۔ اور نہیں تو تمہاری طرح نوکری کی کھٹ پٹ میں پڑ جائیں۔

انور۔ اچھا بھئی اب جاتے ہیں۔ خدا حافظ۔

عزیز۔ خدا حافظ!

دوسرا سین

موقع :۔ ڈونڈلہ جنکشن کے ویٹنگ روم کے دروازے پر عزیز ایک جوان کو ٹہلتا ہوا پاتا ہے، کہ وہ جیسے کسی کا منتظر ہے، لہذا بڑھ کر اس سے ملتا ہے)۔

عزیز۔ آداب عرض۔

اجنبی۔ آداب عرض۔

عزیز۔ معاف کیجئے گا۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو جناب اس خادم کا انتظار......،

اجنبی۔ اوہو......آپ......جی ہاں......آئیے اندر تشریف لائیے،

(دونوں ویٹنگ روم میں داخل ہوتے ہیں)

عزیز۔ مجھے جناب سے نیاز حاصل کر کے بے حد خوشی ہوئی۔

اجنبی۔ جناب کے اخلاق حمیدہ کا میں کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔

عزیز۔ یہ آپ کی برادرانہ محبت ہے۔ اور میں دراصل اس رشتہ کی تجویز کو نہ صرف اپنے لئے بلکہ اپنے خاندان کے لئے باعث فخر سمجھتا ہوں۔

اجنبی۔ آپ کا حسن ظن ہے۔ ورنہ اصل پوچھئے تو یہ رشتہ آپ کے لئے نہیں بلکہ میرے لئے اور میرے خاندان کے لئے باعث فخر ہے!

(ہوٹل کا خانساماں آتا ہے)

خانساماں۔ حضور کچھ چائے وغیرہ

عزیز۔ دیکھو دو آدمیوں کے لئے چائے لاؤ۔ اس کے ساتھ کچھ کیک وغیرہ ہوں۔

خانساماں۔ بہت اچھا۔

(چلا جاتا ہے)

عزیز۔ میں امید کرتا ہوں کہ جو بات خط و کتابت میں طے ہوئی ہے۔ اس پر جناب کو نظر ثانی کی ضرورت نہیں ہے اور مجھے امید ہے کہ

کم از کم جناب کی طرف سے بات پختہ ہے۔

اجنبی۔ قطعی قطعی۔ میری جانب سے تو غیر پختگی کا خیال ہی نہ ہونا چاہیئے،

عزیز۔ تاریخ شادی کے بارے میں عرض ہے۔ کہ جو تاریخ بھی جناب کو مناسب معلوم ہو۔ وہ بہتر ہے۔

اجنبی۔ جس تاریخ میں جناب کو سہولیت ہو۔ وہی بہتر ہوگی۔

عزیز۔ اس معاملہ میں بھلا مجھ سے آپ کیا فرماتے ہیں دراصل مجھ سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ بس اطلاع کافی ہے۔

اجنبی۔ میری عرض ہے کہ چونکہ مجھے کوئی انتظام ہی نہیں کرنا ہے۔ لہٰذا تاریخ کا سوال میرے اوپر رکھنا ہی بے کار ہے۔

عزیز۔ جب جناب کو کوئی انتظام نہیں کرنا ہے۔ تو قاعدے سے مجھے تو اور بھی کچھ نہیں کرنا ہے۔

اجنبی۔ آپ کا فرمانا صحیح ہے۔ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ تاریخ کا معاملہ اصولاً لڑکی والوں کی مرضی پر چھوڑا جاتا ہے اس لئے کہ لاکھ انتظام سہی۔ لیکن کچھ نہ کچھ تو لڑکی والوں کو پھر بھی کرنا ہی پڑتا ہے۔

عزیز۔ یہی تو میں نے کہا۔ کہ جہیز مجھے تیار نہیں کرنا۔ سامان مجھے نہیں خریدنا۔ زیور مجھے نہیں بنوانا۔ لہٰذا میرے لئے تو سب ہی تاریخیں برابر ہیں!

اجنبی۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ خدانخواستہ جہیز اور زیور وغیرہ کا انتظام آپکو وقت کے دقت کرنے کی ضرورت ہوگی بلکہ میرے خیال میں رُوس کے دستور کے مطابق جناب کی ہمشیرہ صاحبہ کا موجودہ سامان ہی اللہ کے فضل سے کافی سے زیادہ ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

عزیز۔ (گھبرا کر، بات کاٹ کر) جی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا فرمایا جناب نے ؟

اجنبی۔ میں نے یہ عرض کیا۔ کہ جناب کی ہمشیرہ صاحبہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

عزیز۔ (پھر بات کاٹ کر) میری ہمشیرہ ؟

اجنبی۔ جی!

عزیز۔ مگر میری تو کوئی بہن نہیں!

اجنبی۔ (چیخ کر) کوئی نہیں!!

عزیز۔ غالباً جناب کو خیال نہیں رہا۔ میں نے اپنے پہلے ہی خط میں لکھا تھا۔ کہ میرا کوئی بھائی بہن نہیں، صرف ایک بہن تھی تو اس کا انتقال ہوگیا!

اجنبی۔ ارے۔ ارے۔ پھر یہ اشتہار آپ نے کس کا دیا ہے اور مجھے کس سے منسوب کیا ہے ؟

عزیز۔ معاف کیجئے گا۔ غالباً میں مذاق کے لائق نہیں!

اجنبی۔ جناب اس قسم کی باتوں کا مطلب۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے پیشتر ہی سے شبہ تھا۔ یہ کیا حرکت ؟

عزیز۔ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے ؛

اجنبی۔ (غصہ میں) میں آپ پر دعوے کر دونگا ؛

عزیز۔ میں خود دعوے کردونگا !

اجنبی۔ آپ نے جھوٹا اشتہار کیسے دیا ؟

عزیز۔ اشتہار دینے والے کی ایسی تیسی۔ لعنت ہے اشتہار دینے والے پر ؛

اجنبی۔ خود تمہارے اوپر لعنت ؛

عزیز۔ بدتمیز۔

اجنبی۔ بیہودہ ؛

عزیز۔ چپ بدمعاش ؛

اجنبی۔ دغاباز مکّار ٹھہر تو جا ،

عزیز۔ تیری ایسی تیسی ؛

(دونوں ایک دوسرے پر جھپٹتے ہیں۔ کرسیاں گرتی ہیں۔ ایک دوسرے کو بدمعاش نالائق۔ پاجی کہتے ہوئے گتھ جاتے ہیں

خانساماں ڈرتا ہوا آتا ہے ؛

خانساماں۔ ہائیں۔ ہائیں۔ ہائیں۔

دلڑنے میں چائے کی کشتی میں دھکا لگتا ہے۔ اور تمام چینی کے برتن گر کر ٹوٹ جاتے ہیں)

خانساماں۔ بس۔ بس۔ بس۔ جانے دیجئے۔ پولیس والا آگیا۔

(شور سن کر ایک کانسٹیبل آتا ہے)

کانسٹیبل۔ یہ کیا گڑبڑ ہے۔؟

خانساماں۔ کچھ نہیں صاحب!

(دونوں علیحدہ ہو جاتے ہیں)

کانسٹبل۔ جناب یہ اسٹیشن ہے۔ ایک صاحب باہر آجائیں۔

(عزیز اٹھ کر چلا جاتا ہے)

تیسرا سین

موقع۔ (ڈرائنگ روم میں) منصور بیٹھا ہوا ہے۔ اور عزیز داخل ہوتا ہے)

عزیز۔ (منصور سے) کیوں جناب مجھے ایسا شبہ ہوتا ہے کہ غلط فہمی ہوئی ہے۔

منصور۔ میں خود اسی سوچ میں تھا۔ کیا جناب اعجاز علیخاں نہیں ہیں؟

عزیز۔ قطعی نہیں۔ میرا نام تو عزیز ہے۔ اور آپ بھی نہیں ہیں۔ آپکا نام؟

منصور۔ قطعی نہیں۔ میرا نام منصور ہے۔

عزیز۔ یہ کیا معاملہ ہے؟

منصور۔ آپ یہاں کیسے آئے؟

عزیز۔ غالباً جس لئے آپ آئے، مجھے اعجاز علیخاں نے اس جگہ ملنے کو لکھا تھا

منصور۔ اور آپ کے ساتھ بھی شاید اپنی بہن کے نکاح کو کہا تھا؟

عزیز۔ اور آپ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

منصور۔ بعینہٖ یہی۔ دیکھئے نا خط۔ آپ بھی خط نکالئے۔

عزیز۔ یہ لیجئے سب خط موجود ہیں۔

منصور۔ یہ دیکھئے۔ یہ دیکھئے۔

(دونوں خط دیکھنے کے بعد کہتے ہیں)

عزیز۔ میرے اور آپ کے یعنی دونوں کے خط ایک سے ہیں۔ اس دغاباز نے خوب ہم دونوں کو احمق بنایا۔ اور لطف یہ کہ آپ نے بھی یہ نہ بتایا بلکہ اُلٹا لڑ پڑے؟

منصور۔ لڑ میں پڑا یا آپ۔ اس بدمعاش نے بیک وقت ہم دونوں کا انتخاب کر کے دھوکہ دے کر یہاں مفت خدا لڑوایا۔

عزیز۔ اس ناہنجار سے بدلہ لینا چاہیئے۔

منصور۔ دعوےٰ کرنا چاہیئے۔

(خانساماں ٹوٹے ہوئے برتنوں کا بل پیش کرتا ہے)

خانساماں۔ یہ لیجئے حضور۔ برتنوں کا بل حاضر ہے۔ دس روپیہ قیمت برتن اور ڈیڑھ روپیہ چائے وغیرہ۔

عزیز۔ دس روپیہ کے برتن۔

منصور۔ صرف دو پیالیوں۔ تین طشتریوں اور ایک چائے دانی کی قیمت دس روپے کیسے ہوئی ؟

خانساماں۔ پورے سیٹ کے دام دینا پڑینگے ؛

عزیز۔ سیٹ کے بھی دس روپے کہاں سے ہو گئے ؟

خانساماں۔ اب ہوں یا نہ ہوں ؛

منصور۔ ہم دو روپے سے زیادہ ہرگز نہیں دے سکتے۔

خانساماں۔ دینا تو حضور کو پڑینگے۔

عزیز۔ مت بکواس کرو۔ بدمعاش کہیں کا۔

خانساماں۔ ذرا زبان سنبھال کر بولئے گا۔

منصور۔ نکل جاؤ یہاں سے۔

خانساماں۔ واہ صاحب واہ۔ ایک تو لڑ بھڑ کر برتن توڑ ڈالے اور پھر۔

عزیز۔ مت بکواس کرو ؛

منصور۔ چُپ رہو گستاخ ؛

خانساماں۔ واہ صاحب ؛

(اتنے میں اعجاز علیخاں معہ اپنے دوست نسیم کے داخل ہوتے ہیں)

اعجاز علیخاں۔ ہائیں۔ ہائیں۔ کیا ہے۔

خانساماں۔ دیکھئے تو صاحب اول تو خود آپس میں لڑ کر برتن توڑ ڈالے

اور اب دام نہیں دیتے ۔ اور گالیاں دیتے ہیں،

منصور۔ مت بکو۔

اعجاز علیخاں۔ خانساماں تم بہت گستاخ ہو۔ دام تمہارے ابھی مل جائینگے
ابھی جاؤ اور پہلے چار آدمیوں کے لئے چائے وغیرہ لاؤ جلدی۔

خانساماں۔ بہت اچھا۔

(چلا جاتا ہے)

اعجاز علیخاں۔ (منصور اور عزیز کی طرف مخاطب ہو کر) اگر اجازت ہو
تو دونوں صاحبان کی خدمت میں کچھ عرض کردں سب سے پہلے تو
میں دخل در معقولات کی معافی چاہتا ہوں۔ پھر اس کے بعد اسکی
معافی کہ پہلی گاڑی سے نہ پہنچ سکا جس کی وجہ سے آپ دونوں
صاحبان کو چائے کا سیٹ توڑنا پڑا۔ غالباً اب دونوں صاحبان
مجھے پہچان گئے ۔ میرا نام اعجاز علیخاں ہے ۔ اور یہ میرے دوست
مسٹر نسیم ہیں۔

عزیز۔ ارے۔

منصور۔ جناب ۔جناب ۔

عزیز۔ افوہ۔

منصور۔ مگر۔ مگر۔

اعجاز۔ گھبرائیے نہیں۔ آپ دونوں صاحبان تو خوب آپس میں مل لئے۔ اب میرے دوست مسٹر نسیم سے ملئے۔ نسیم صاحب آئیے۔ میرے خاص کرمفرما مسٹر عزیز اور آپ مسٹر منصور ہیں۔

نسیم۔ آپ صاحبان سے نیاز حاصل کر کے مجھے بیحد خوشی ہوئی۔

عزیز۔ خوشی تو مجھے بھی ہوئی۔ مگر پہلے میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ جناب نے ہم دونوں کو اس جگہ کیوں بلایا تھا؟

اعجاز۔ مجھے بیحد افسوس ہے۔ کہ آپ مجھ سے ایسی بات پوچھتے ہیں جو آپ کو بخوبی معلوم ہے۔

عزیز۔ بندہ پرور فضول باتوں کو جانے دیجئے۔ میں یہ عرض کرتا ہوں کہ جناب نے مجھے کیوں یقین دلایا۔ کہ میرا قطعی طور پر انتخاب ہو چکا ہے؟

اعجاز۔ محض اس وجہ سے کہ یہ امر واقع ہے کہ میں آپ کا انتخاب کر چکا ہوں

منصور۔ (چمک کر) پھر مجھے کیوں طلب فرمایا۔ آپ کو یہ اختیار حاصل نہیں تھا؟

اعجاز۔ میری دانست میں مجھے یہ اختیار حاصل تھا لیکن اگر آپ صاحبان نہیں ملنتے تو خیر۔ میں اپنی غلطی سمجھ کر اس کی معافی مانگتا ہوں کہ آپ دونوں صاحبان کا پیشتر ہی تعارف نہ کرا دیا۔ دراصل غرض میری ہی اٹکی ہے۔ لڑکی والا ہر طرح جا بے جا دبتا ہے۔ میری تو یہ مرضی

تھی۔ کہ آپ دونوں صاحبان ایک دوسرے سے نہ ملنے پائیں۔ مگر میری بدقسمتی کہیئے۔ کہ آپ دونوں صاحبان آپس میں مل جل لئے۔ اب میری غلطی کو معاف کیجئے۔ ایک صاحب کی میں تلافی کر دونگا۔ لیکن اب سوال یہ ہے۔ کہ موجودہ صورت میں آپ دونوں میں سے مجھے ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ مجھے آپ دونوں صاحبان بے حد پسند ہیں لیکن جو دشواری میرے سامنے پیش ہے۔ اس کا اندازہ خود لگا سکتے ہیں۔ لہٰذا عرض ہے کہ اگر آپ صاحبان مذاق نہ سمجھیں تو صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے یہی بہتر معلوم ہوتا ہے۔ کہ یا تو آپ دونوں میں سے ایک صاحب خود علیحدہ ہو جائیں ورنہ آپس میں لاٹری ڈال لیں،

عزیز۔ لاٹری ڈال لیں؛

اعجاز۔ کم از کم مجھ میں تو اتنی ہمت نہیں ہے۔ کہ آپ دونوں میں سے کسی کی بھی توہین کروں۔ یعنی یہ کہہ دوں کہ میں تم کو پسند نہیں کرتا۔ بہتر ہے اس معاملہ پر آپ دونوں صاحبان آپس میں مشورہ کر لیں،

عزیز۔ بہتر ہے۔ ہم دس منٹ کے لئے باہر جاتے ہیں۔

(عزیز اور منصور چلے جاتے ہیں)

ڈپلیٹ فارم کے ایک علیحدہ حصے میں جو بھیڑ بھاڑ سے علیحدہ

ہے عزیز اور منصور باتیں کرتے ہیں)

عزیز۔ بڑا بدمعاش ہے۔ اس کے پھندے سے بچنا چاہیئے۔

منصور۔ سخت خطرناک ہے۔ اس سے دُور ہی رہنا چاہیئے۔

عزیز۔ پھر کیا کرنا چاہیئے۔

منصور۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

عزیز۔ پھر میں ہٹا جاتا ہوں۔

منصور۔ آپ کی مرضی۔

عزیز۔ میری مرضی کیا۔ جیسا آپ کہیں۔ کوئی صورت تجویز کیجئے۔

منصور۔ جب آپ ہٹے جاتے ہیں۔ تو پھر دوسری تجویز کی کیا ضرورت ہے۔

عزیز۔ مگر یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔

منصور۔ کیوں ؟

عزیز۔ ذرا ویسا معلوم ہوتا ہے۔

منصور۔ ویسا کیسا ؟

عزیز۔ تو پھر...... تو پھر آپ نہ ہٹ جائیں۔

منصور۔ تو پھر لاٹری ہی رہنے دیجئے۔

عزیز۔ کیا ہرج ہے۔ چلئے پھر کہہ دیں کہ لاٹری سے ہی تصفیہ ٹھیک رہیگا۔

(ڈرائنگ روم میں آکر اعجاز اور نسیم صاحب سے)

منصور۔ عزیز صاحب کا اور میرا بھی یہی خیال ہے۔ کہ لاٹری سے تصفیہ بہتر رہے گا۔

اعجاز۔ لیجئے جناب۔ ان پڑیوں میں سے آپ دونوں صاحبان ایک ایک اُٹھالیں۔

(دونوں۔ ایک ایک پڑیا اٹھاتے ہیں)

نسیم۔ اچھا اُٹھالی پڑیا۔ اب کھولئے۔

(دونوں کھولتے ہیں)

نسیم۔ لائیے میں دیکھوں منصور صاحب .... اوہو۔ خالی ہے۔ خالی نکل گئی۔ آپ ناکام رہے ...... عزیز صاحب مبارک مبارک۔

منصور۔ اور میں بھی بعد شکست مسٹر عزیز کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

عزیز۔ شکریہ۔ شکریہ۔ تسلیم۔

نسیم۔ بھئی اعجاز۔ بہنوئی مبارک ہو۔ بھئی بہنوئی سے اس خوشی میں گلے تو مل لو عزیز صاحب شرمائیے گا مت۔

(دونوں گلے ملتے ہیں)

نسیم۔ بس بس۔ اب مل لئے گلے۔ اعجاز صاحب اب بہنوئی سے گلے ملنے کی خوشی میں ایک چائے کا دور پھر رہے۔

اعجاز۔ ضرور۔ ضرور۔ .... خانساماں!

خانساماں۔ جی حضور!

اعجاز۔ چائے اور کیک پیسٹری وغیرہ!

نسیم۔ جلدی لاؤ!

خانساماں۔ بہت اچھا!

(چلا جاتا ہے)

اعجاز۔ کیوں نسیم صاحب آپ نے عزیز صاحب کو پہچاننے میں تامل کیسے کیا تھا!

نسیم۔ تامل تو خیر کیا۔ مگر ہاں پہلی نظر میں نہ پہچان سکا۔ دراصل میں نے تصویر ہی دیکھی تھی!

اعجاز۔ تو کیا تصویر اور اصل میں کوئی خاص فرق ہے!

نسیم۔ فرق تو نہیں مگر ہاں پہلی نظر میں پہچاننا ذرا دشوار ہوا، اس لئے کہ تصویر دیکھ کر کم از کم میں تو یہی سمجھا تھا کہ تمہاری طرح خوب گورے چٹے ہونگے!

اعجاز۔ مگر عزیز صاحب خدانخواستہ کالے تو نہیں ہیں۔ ذرا ادھر بڑھائیے تصویر۔ ہاں تصویر سفیدی مائل زیادہ کردی ہے

عزیز۔ (کھنکار کر) جلدی میں جیسی بھی فوٹو گرافر نے تصویر دیدی میں نے

لاپرواہی سے لے لی۔

اعجاز۔ تو خدانخواستہ یہ مطلب ہمارا تھوڑی ہے۔ کہ آپ نے جان بوجھ کر فوٹوگرافر سے ایسا کہا ہوگا۔ کہ تصویریں آپ کو بالکل ہی گوراچٹا اور سفید دکھائے؛

عزیز۔ جی ہاں۔ عرض کیا نا۔ میں نے تو جلدی میں غور سے دیکھی بھی نہیں؛

خانساماں۔ حضور چائے حاضر ہے؛

نسیم۔ ادھر رکھو۔ رکھدو۔ بس لیجئے عزیز صاحب ..... لیجئے کرسی بڑھا لیجئے۔ آئیے نا منصور صاحب۔

عزیز۔ (کرسی بڑھاتا ہے) اور آگے آجائیے۔ منصور صاحب۔

منصور۔ جی ہاں؛

(چائے شروع ہو جاتی ہے)

نسیم۔ فوٹو کے بارے میں تو اعجاز صاحب بات دراصل یہ ہے فوٹوگرافروں کی بھی کوئی خطا نہیں ہے۔ بعض جاہلوں کا یہ حال ہے۔ کہ اگر تصویر میں اُن کو گوارا نہ کردیں۔ تو تصویر ہی واپس کردیں؛

اعجاز۔ اجی حضرت۔ دراصل کالے اور گورے کی بحث ہی فضول ہے۔ بات تو یہ ہے۔ کہ انسان کے وصف دیکھے جاتے ہیں؛

منصور۔ واقعہ تو یہ ہے؛

نسیم ۔ عزیز صاحب آپ کیک نہیں کھاتے ۔ لیجئے نا !

عزیز ۔ جی ہاں ۔ آپ لیجئے !

نسیم ۔ معاف کیجئے گا ۔ عزیز صاحب ۔ قدرتاً آپ کچھ انتہا سے زیادہ ۔۔۔
معاف کیجئے گا ۔ کچھ طبیعت میں لاپروائی زیادہ معلوم ہوتی ہے !

عزیز ۔ نہیں تو قطعی نہیں !

نسیم ۔ مگر ابھی تو شاید آپ نے فرمایا تھا ۔ آپ سخت لاپروا ہیں تصویر لیتے
وقت پروا تک نہ کی ۔ یہ بھی نہ دیکھا ۔ کہ کیسی ہے اور کیسی نہیں !

اعجاز ۔ جلد باز معلوم ہوتے ہیں ۔ معاف کیجئے گا عزیز صاحب ۔

عزیز ۔ نہیں صاحب جلد باز تو میں نہیں !

نسیم ۔ یہ غلط ہے ۔ محض تصویر لینے میں جلد بازی کی تو اس کے سبب سے
آپ جلد باز نہیں کہہ سکتے ۔

اعجاز ۔ اور محض تصویر لینے میں لاپروائی کرنے پر لاپروا آپ نے کیسے کہا ؟

نسیم ۔ جی نہیں آپ نے محض تصویر لینے میں لاپروائی نہیں کی بلکہ کیک
کھانے میں بھی سخت لاپروائی کر رہے ہیں ۔

(قہقہہ سب مل کر لگاتے ہیں)

اعجاز ۔ ارے نسیم صاحب ۔ میں بھولا ہی جاتا تھا ۔ ارے بھئی وہ چک تو
دیدو ۔ کہیں رہ نہ جائے !

نسیم۔ اوہو! جیب میں ہی رہ جاتا .... یہ لیجئے صاحب،

(چک نکال کر دیتا ہے اور عزیز لیتا ہے)

اعجاز۔ دو ہزار کا یہ چک۔ بقیہ تین ہزار اسی ہفتہ میں انشاء اللہ پہنچ جائیگا'

عزیز۔ ایسی جلدی کیا تھی؛

نسیم۔ عزیز صاحب آپ ایف اے میں فیل ہو گئے تھے شاید،

عزیز۔ میں کیا عرض کروں۔ عین امتحان سے پہلے سخت بیمار پڑا۔ بچنے کی امید نہ تھی۔

اعجاز۔ افوہ! غالباً اسی گڑبڑ میں پھر تعلیم بھی جاری نہ رکھ سکے،

عزیز۔ جی ہاں بیماری نے کمزور کر دیا۔ اور ڈاکٹروں نے آرام کا مشورہ دیا۔ دراصل بیماری کے اثرات دس گیارہ ماہ تک رہے!

نسیم۔ تو یہ کہئیے خدا نے بڑا فضل و کرم کیا،

عزیز۔ واقعی خدا کا بڑا فضل و کرم ہُوا۔

نسیم۔ دراصل آپ کی تندرستی بہت خراب ہے کچھ گھن سا صحت میں لگ گیا ہے۔

عزیز۔ نہیں تو؛

نسیم۔ آپ ہی نے تو ابھی فرمایا۔ کہ امتحان کے بعد بیماری کا سلسلہ دس گیارہ ماہ تک جاری رہا۔

عزیز۔ (گھبرا کر) میں تو بالکل تندرست ہوں ذرہ بھر شکایت نہیں کسی قسم کی شکایت نہیں!

نسیم ۔ دوا تو جاری ہو گی۔

عزیز۔ نہیں صاحب۔ لاحول ولا قوۃ۔

نسیم۔ عزیز صاحب معاف کیجئے گا۔ یہ بیماری ہے۔ بیماری جی...... یہ تصویر نہیں ہے کہ لاپروائی چل جائے۔ یہ صحت کا معاملہ ہے۔ اور ابھی دن کے ہوئے۔ جو پچھلے مہینے تک شکایت تھی۔ معاف کیجئیگا اور اس پر یہ لاپروائی کہ دوا ندارد۔

اعجاز۔ عزیز صاحب۔ دوا تو جاری رکھنا تھی!

عزیز۔ (گھبرا کر اور جل کر) اجی حضرت آپ کیسی باتیں کرتے ہیں لاحول و لاقوۃ پچھلے مہینے تو یونہی خفیف سی دردسر کی شکایت ہو گئی جو خود بخود جاتی رہی!

نسیم ۔ کوئی دوا نہیں کی!

عزیز۔ کوئی نہیں۔ خود ہی جاتا رہا۔ کوئی بات بھی ہو!

نسیم۔ عزیز صاحب ...... عزیز صاحب۔ میرے پیارے عزیز صاحب دردسر بری بلا ہے!

اعجاز۔ خدا بچائے اس خوفناک بیماری سے۔

نسیم ۔ اور پھر اس میں لاپروائی!

اعجاز۔ ستم ہے۔ لاپروائی تو ستم ہے۔ بری چیز ہے۔ دردِ سر۔

نسیم۔ تمام بیماریوں کا پیش خیمہ یہی دردِ سر تو ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے۔ کہ آنت بھاری تو ماتھا بھاری۔ آنتوں میں خرابی ہوئی نہیں۔ کہ دردِ سر ہوا ابخرے بھکابھک دماغ کی طرف چڑھے۔ اور ذرا لاپروائی ہوئی نہیں کہ مادہ چلا سینے کی طرف۔ پھر تپ دق ہو جائے۔ نمونیہ ہو جائے۔ جو کچھ بھی نہ ہو غنیمت ہے؛

اعجاز۔ نسیم صاحب۔ دراصل ولی محمد مرحوم کو جو دق ہوئی تو پہلے سر میں ہی درد ہوا تھا؛

عزیز۔ (برا مان کر) واللہ اعلم۔ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میں قطعی تندرست ہوں۔ امتحان سے پہلے البتہ بیمار پڑ گیا تھا۔ اور چونکہ کامل صحت ہونے سے پہلے ہی امتحان دینا پڑا لہٰذا ناکام رہا؛

اعجاز۔ سال بھر کی پوری محنت رائگاں گئی؛

عزیز۔ اور کیا۔

نسیم۔ جو کچھ بھی سال بھر میں لکھا پڑھا۔ وہ بھول گئے ہونگے محنت تو سخت کی ہو گی؛

اعجاز۔ محنتی تو آپ معلوم ہوتے ہیں۔

عزیز۔ سال بھر جس پتہ ماری سے میں نے محنت کی ہے۔ بس میں ہی

جانتا ہوں۔ دن اور رات ایک کر دیا تھا۔

نسیم۔ اعجاز صاحب۔ در اصل عزیز صاحب کا حافظہ کچھ کچھ ...... مطلب یہ کہ بیحد کمزور معلوم ہوتا ہے۔ اور کچھ ذہن بھی۔ مطلب یہ کہ ویسے ذہن کند تو نہیں بالکل۔ مگر کچھ .... ذرا .... میرا یہ کہ ذرا کند ذہن۔ یعنی کہ بالکل ہی کند ذہن آپ نہیں کہہ سکتے۔ معاف کیجئے گا عزیز صاحب۔

عزیز۔ جناب میرا حافظہ اور ذہن ہمیشہ سے تیز ہے۔ اور آپ کا خیال قطعی غلط ہے!

نسیم۔ ممکن ہے غلط ہو!

اعجاز۔ بہت ممکن ہے غلط ہو!

نسیم۔ لیکن ابھی ابھی تو آپ نے فرمایا تھا۔ کہ سال بھر کی سخت پڑھائی چار دن کی بیماری میں چوپٹ کر دی۔ سال بھر کی پڑھائی صرف چند روز میں بھول جانا ذہن اور حافظہ کی خرابی کی بڑی زبردست دلیل ہے۔

اعجاز۔ مگر نسیم صاحب۔ ایک بات پر آپ نے غور نہیں کیا کچھ بھی ہو وہ کُند ذہن ہوں۔ خواہ حافظہ خراب ہو۔ لیکن طباع معلوم ہوتے ہیں۔

نسیم۔ بیحد طبّاع تو ہیں عزیز صاحب!

اعجاز۔ طبّاع تو ماننا پڑیگا۔ مگر عزیز صاحب آپ نے انگریزی کہاں تک پڑھی ہے؟

عزیز۔ الیف۔ اے تک۔

نسیم۔ مگر ابھی تو آپ نے کہا تھا۔ کہ الیف اے میں فیل ہو گئے؛

عزیز۔ جی ہاں۔

نسیم۔ تو یہ الیف۔ اے تک کہاں ہُوئی۔ یہ تو انٹرنس ہی تک ہوئی؛

عزیز۔ انٹرنس ہی تک سمجھیئے؛

نسیم۔ مطلب دراصل ہمارا یہ ہے۔ کہ ہم انگریزی پر ذرا زیادہ زور دیتے ہیں؛

اعجاز۔ بیحد...... بیحد زور دینے کے عادی ہیں۔

نسیم۔ دراصل ہمیں انگریزی تلفظ کا بیحد فکر ہے؛

اعجاز۔ سخت متفکر رہتے ہیں؛

نسیم۔ وجہ یہ ہے۔ کہ ہماری بہن کے ساتھ آپ کو عمر کاٹنا ہے۔ دن رات انگریزی دان سوسائٹی میں اُٹھنا بیٹھنا۔ غالباً تلفظ تو آپ کا بہترین ہوگا

عزیز۔ میں کچھ عرض نہیں کر سکتا،

نسیم۔ اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو۔ تو یہ لیجئے ...... اخبار ..... ذرا پڑھئے تو؛

عزیز۔ معاف کیجئے گا۔ اس طرح پڑھنا میں شاید پسند نہ کروں۔

اعجاز۔ بھائی میرے۔ اب تم ہمارے ہو۔ بُرے ہو تو۔ بھلے ہو تو۔ بُرا تلفظ

ہے تو بھلا ہے تو۔ آخر عزیز رشتہ دار سب ہی تو پوچھیں گے۔ پھر ہم
کب ولایت پاس ڈھونڈ رہے ہیں؟

نسیم۔ اس میں کیا مضائقہ ہے؟

عزیز۔ میں پسند نہیں کرتا۔

نسیم۔ برادرم۔ تم بیچارے کیا اور تمہاری پسند کیا۔ سالوں کی ضد اور بحث
کے آگے میاں کسی کی بھی چلتی ہے۔ بھیّا۔ وہ جو کسی نے کہا ہے۔ تو
سچ کہا ہے۔ ساری خدائی اک طرف جورو کا بھائی اک طرف (قہقہہ)
بھائی صاحب ابھی تک تو سالے کی ضد ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا
ہے کیا۔ تریاہٹ کا سامنا کرنا ہے۔ (قہقہہ) جہاں ضد آئیگی جورو
اور جورو کے بھائی کی جیت ہوگی۔ مذاق نباشد۔ یہ سالے کی ضد ہے۔

اعجاز۔ ضد تو ہے۔ منصور صاحب سفارش کیجئے۔

منصور۔ (چیخ کر) عزیز صاحب میں سفارش کرتا ہوں۔ آپ ہارے .....
ہارنا پڑے گا آپ کو..... یہ لیجئے اخبار پڑھئے۔ ابھی میں ہوتا آپکی
جگہ۔ تو پڑھنا چھوڑ گانے لگتا۔ اور گانا تو گانا ناچنے کو کہتے تو بھی انکار
نہ کرتا۔

(سب قہقہہ لگاتے ہیں)

عزیز۔ اب لوگ مجھے احمق بناتے ہیں۔

منصور۔ تو اس میں کیا کچھ شک بھی ہے۔ میاں شادی کا خیال آتے ہی عقل کو رخصت کر دینا چاہیئے۔ اور پھر سالے بہنوئی کا ویسے مذاق کا رشتہ بھی ہے۔

(قہقہہ لگاتے ہیں)

نسیم۔ ذرا پڑھیئے۔ تکلف کاہے کا ہے؛

عزیز۔ (کھنکار کر)۔

(اخبار اُٹھا کر پڑھتا ہے۔ کوئی دس پندرہ سطریں پڑھتا ہے۔ کہ نسیم کہتا ہے)۔

نسیم۔ اونہہ ہوں۔ الہی توبہ!

اعجاز۔ (منہ بگاڑ کر) بس۔ بس۔ بس۔ بس۔ رہنے دیجئے۔

(عزیز رک جاتا ہے)

اعجاز۔ نسیم صاحب۔ اب بتائیے کیا کریں۔

نسیم۔ عزیز صاحب۔ معاف کیجئے گا۔ آپ انگریزی کو ہندی میں پڑھتے ہیں۔ یا مارواڑی میں۔ ہماری بہن کی زبان بگڑ جانے کا کتنا سخت اندیشہ ہے۔

اعجاز۔ سوال صرف یہ ہے کہ اب کیا ہو۔

نسیم۔ یہی ہو کہ جلد سے جلد ایک انگریز لیڈی کو آپ کے اوپر مامور کیا

جائے۔ کہ آپ کے ساتھ رہیں۔ اور انگریزی تلفظ ٹھیک کرائیں؟

اعجاز۔ مس کوپر کیسی رہیں گی؟

نسیم۔ دیکھئے صاحب، ہماری بہن کی ایک سہیلی ہے۔ نوجوان مس میری کوپر بڑی ہنس مکھ باتونی لڑکی ہے۔ تکلیف تو ہوگی مگر ہم جا کر اُسے بھیجے دیتے ہیں۔ ایک مختصر سا بنگلہ اسے دلا دیجئے۔ اور کم از کم دو ماہ تک اس کے ساتھ رہیئے۔ خرچہ سب ہمارے ذمے۔ انتظام آپ کو کرنا ہوگا۔ گھر پہنچ کر فوراً انتظام کر کے ہمیں تار سے مطلع کیجئے۔ ورنہ یہ تلفظ کا مسئلہ یوں حل نہ ہوگا۔

عزیز۔ بہت اچھا۔

نسیم۔ بہت اچھا نہیں۔ لاپروائی نہ ہو۔ اس میں حتی الوسع آپ انگریزی لہجہ اختیار کریں۔

(ٹن۔ ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن)

اعجاز۔ اوہو! پنجاب میل آگیا۔ عزیز صاحب اب وہ اصل معاملہ یعنی تاریخ وغیرہ کے معاملے میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور چند ضروری امور خاص طور پر ایک امر کے بارے میں نہایت اہم معاملہ ہے۔ زبانی ذرا نامناسب معلوم ہوتا ہے لہذا بہتر نہ ہو۔ کہ میں ایک رقعے پر لکھ دوں۔ اور آپ سوچ سمجھ کر جواب لکھ دیں؟

عزیز۔ جیسی آپ کی رائے ہو۔

اعجاز۔ نسیم صاحب کاغذ ہو گا۔؟

نسیم۔ یہ لیجئے۔ بلکہ لفافہ بھی۔

(اعجاز جلدی جلدی لکھتا ہے)

اعجاز۔ یہ لیجئے عزیز صاحب۔

نسیم۔ بند کر دو لفافہ۔

اعجاز۔ کر دو بند۔ خواہ رہنے دو، یہ۔ یہ لیجئے۔ باہر جا کر سوچ کر جواب لکھ لائیے گا۔

عزیز۔ (لفافہ لیکر) بہت اچھا۔

(جاتا ہے مگر دروازے تک پہنچتا ہے کہ اعجاز پکارتے ہیں)

اعجاز۔ عزیز صاحب۔ ذرا ٹھہرئیے گا۔ (منصور سے) کیوں منصور صاحب آپ بھی اپنے دوست کو مشورہ دیتے۔ تو بہتر تھا...۔ عزیز صاحب کوئی ایسی خفیہ بات نہیں ہے۔ بہتر ہے منصور صاحب سے بھی مشورہ لے لیں۔

منصور۔ میں حاضر ہوں۔

عزیز۔ بہتر ہے آئیے۔

(منصور اور عزیز دونوں ویٹنگ روم سے نکل جاتے ہیں)

(ویٹنگ روم کے باہر پلیٹ فارم پر علیحدگی میں عزیز اور منصور

لفافہ کھولتے ہیں)

منصور۔ خدا معلوم لفافے میں کیا ہے۔ کھولئے جلدی کھولئے (کھولتا ہے)

پڑھئے پڑھئے۔ ذرا اونچا پڑھئے (پڑھتا ہے)۔

عزیز۔ مجھ کو آتے ہی معلوم ہو گیا۔ کہ آپ دونوں صاحب اول نمبر کے احمق اور لڑاکا بیل ہیں اور سخت بدتمیز ہیں۔ عقل بھی نہیں رکھتے میری در اصل دو بہنیں ہیں۔ اور دونوں بال بال بچیں۔ طے تو میں اسی وقت کر چکا تھا۔ کہ آپ دونوں صاحب اول نمبر کے گدھے ہیں۔ مگر پنجاب میل کا بہر صورت انتظار تھا۔ اور اب میں رخصت ہوتا ہوں۔ خدا حافظ۔ ہوٹل کا بل آپ دونوں صاحبان غالباً ادا کر ہی دینگے۔ اور نیز چیک کو بھی غور سے دیکھ لینگے۔ فقط

آپ کا خادم:۔ اعجاز علیخاں۔

عزیز۔ ارے! سال بھر پیشتر کی تاریخ کا چیک ہے؛

منصور۔ بڑا پاجی نکلا۔ ارے پکڑو بدمعاش کو۔

عزیز۔ دوڑو۔ جاتا کدھر ہے۔

(بھاگ کر ویٹنگ روم کی طرف جاتے ہیں)

عزیز۔ ارے وہ بدمعاش کہاں گئے دونوں؛

خانساماں۔ کون بدمعاش؛

منصور - ارے وہی دونوں جو ....،

چپراسی - وہ آپ کے دوست .... وہ تو گئے .. ....ادھر سے نکل کر میل کی طرف ؛

عزیز - پنجاب میل ....،

منصور - ہاں پکڑو بدمعاشوں کو -

عزیز - دوڑو -

منصور - ارے - ارے - رے نکل گئے بدمعاش وہ دیکھو بدمعاش جھانک رہے ہیں -

عزیز - (بڑے زور سے چلا کر) بدمعاشو نکل گئے ہمارے ہاتھ سے گھونسوں سے سر پھوڑ دیتے ؛

منصور - بدمعاش دونوں (سلام کر رہے ہیں)"

عزیز - دعوے کرنا چاہیئے ؛
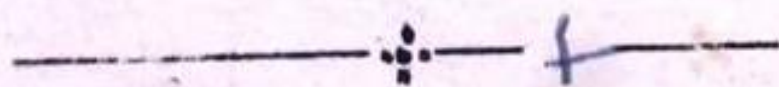
کیا کبھی تم پر بھی کوئی عاشق ہُوا ہے؟

ایک تو وہ لوگ ہیں جن کو خوبصورت ترین ہستی یعنی خدا نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے جیسے رسالوں کے ایڈیٹر۔ یا شیطان کے کان بہرے، خود ہماری گھروالی۔ اور دوسرے وہ لوگ ہیں جن کو شاید خدا تعالیٰ نے فرشتوں سے ٹھیکہ پر بنوایا ہے۔ اور ان ٹھیکیداروں نے ہم خاکی پُتلوں کو اس تیزی سے بنا بنا کر پھینکا کہ کہیں کسی افسانہ نگار کے پُتلے پر کسی سیٹھ صاحب کا پُتلا گرا کسی وکیل پر گاما کا پُتلا گرا تو افسانہ نگار صاحب اور وکیل صاحب کی ناک کہیں پہنچی، ہونٹ کہیں پہنچے اور جب رُوح پھونکی گئی تو اچھے خاصے "حلُوتہ" بن گئے۔ پھر اُس پر طُرّہ یہ کہ بہ ایں شکل وصورت خدائے تعالیٰ نے اُن کے مختصر سینے کو محبّت کے نور سے کوہ سینا بنا دیا اب جو جوانی پر پہنچتے ہیں تو دل کا تو یہ حال کہ ہر ایک کو دینے کو تیار ہیں پر مصیبت یہ کہ حُلیہ شریف کو دیکھتے ہُوئے کوئی کانی کھُتری بھی محبت کی روادار نہیں۔ نتیجہ یہ کہ کوئی لڑکی ان پر عاشق نہیں ہوتی۔ سُنتے ہیں کہ فلاں عورت فلاں شخص پر عاشق ہوگئی۔ فلاں لڑکی فلاں کے ساتھ بھاگ گئی۔ مگر کوئی نہیں بھاگتی تو ہمارے ساتھ۔ کوئی نہیں عاشق ہوتی تو ہم پر۔ مجبور ہو کر دغا فریب سے گھروالی

ڈھونڈتے ہیں اور پھر دن رات اسی کوشش میں رہتے ہیں کہ کہیں گھروالی کے دل سے بھی نہ اُتر جائیں۔

۱
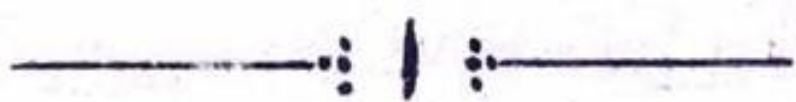
ایک روز کا ذکر ہے کہ میں ایک مقدمہ کی بحث تیار کر رہا تھا کہ اتنے میں گھروالی دوڑی ہوئی آئی۔ بدحواسی کا عالم اور مجھ سے گھبرا کر کہا کہ جُمیا فجّو خاں سپاہی کے ساتھ بھاگ گئی اب میں کیا عرض کروں کہ اس خبر کو سنتے ہی مجھ پر کیا گذری کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ فجّو خاں کو خوش قسمت خیال کروں یا محترمہ جُمیا کے انتخاب کی داد دوں۔ پہلے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یہ بتلادوں کہ یہ جُمیا کون تھی۔

گندمی رنگ، کتابی چہرہ۔ کھڑی ناک۔ اور پتلے ہونٹوں والی ایک پندرہ برس کی لڑکی تھی۔ میں اکثر دیکھتا کہ سامنے ایک سڑک پر بل کھاتی۔ گھومتی نہایت ہی چلبلے پن سے گنگناتی بالکل اپنی رنگ برنگی اوڑھنی میں ایک رنگین تتلی کی طرح ہوا میں چٹکیاں سی بجاتی چلی جا رہی ہے۔ برخلاف اس کے فجّو خاں ایک ۴۵ برس کے بھوت۔ اس سے زیادہ ان کے سپاہیانہ حُسن کی نہ تو میں تعریف کر سکتا ہوں اور نہ کرنا چاہتا ہوں معاً مجھے خیال ہوا کہ دیکھو تو اس جُمیا کو کہ پڑوس میں اوّل تو ہم خود رہتے ہیں گو خوبصورت تو نہیں ہیں مگر بھوت بھی نہیں ہیں علاوہ ہمارے عبدالعزیز

رہتے ہیں اور ایک سے ایک خوبصورت جوان رہتا ہے مگر اس کمبخت چھوکری نے ہم لوگوں میں سے کسی کو پوچھا تک نہیں۔ اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اگر وہ کہتی تو میں اُس کے ساتھ بھاگ جاتا یا کسی طرح بھی اُس کو اپنے اوپر عاشق ہو جانے کی اجازت دے دیتا مطلب میرا دراصل یہ ہے کہ اُسے تو کم سے کم ایسا نہ کرنا چاہیئے تھا اور گو ہم راضی نہ ہوتے پھر بھی یہ کیسے ممکن ہے کہ ہماری طبیعت خوش نہ ہوتی۔ اب لُطف تو دیکھئے کہ مقدمہ جس کی میں بحث تیار کر رہا تھا وہ بھی ایسا ہی دلخراش تھا۔ مقدمہ یہ تھا۔ کہ ایک صاحب ایک اچھی صورت شکل کی چھوکری کو لے اُڑے۔ نتیجہ یہ کہ پکڑے گئے تو میرے پلّہ پڑ گئے اور مجھے وکیل کیا۔ اب اس مقدمہ کی بحث تیار ہو رہی تھی۔ ہمارے ملزم کی طرف سے عذر یہ تھا کہ صاحب لڑکی تو ہم نے ضرور بھگائی۔ مگر واقعہ یوں ہے کہ خود لڑکی اپنی راضی خوشی سے ملزم پر عاشق ہو کر اور زور دے کر اُس کے ساتھ چلدی۔ ملزم نے اپنی داستان عشق اپنے اقبالی بیان میں بڑی دلچسپی سے بیان کی تھی۔ کس طرح لڑکی اُسے ملی۔ کس طرح لیلیٰ کی طرح وہ ان حضرت پر عاشق ہو گئی اور پھر کس طرح۔ ع "کچھ ایسا دونوں طرف عشق کا اثر پھیلا"...... کہ میرے موکل صاحب اپنی محبوبہ کو لے کر فرار ہونے پر مجبور ہوئے۔

میں صحیح عرض کرتا ہوں کہ میرے موکل صاحب نے جب گھر پر یہ

قصہ بیان کیا اور سچ سچ حال بتایا تو میں نے اوّل تو اُن کی صورت دیکھی۔ بہت غور سے۔ یہ دیکھنے کو کہ یا اللہ میں زیادہ خوبصورت ہوں یا یہ؟ کالا ہونا اوّل تو کوئی جرم نہیں اور پھر یہ واقعہ ہے کہ خوبصورتی اور بدصورتی سے اسے گو تعلق قطعی نہیں ہے لیکن جب دوسرے اعضا۔ یعنی آنکھ۔ ناک ہونٹ وغیرہ بغاوت پر آمادہ ہوں تو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ سیاہی سونے پر سہاگہ کا کام دیتی ہے۔ چنانچہ میں نے غور سے اپنے موکل کے چہرے کو دیکھا اور کچھ مشکوک نگاہوں سے دیکھ کر اُن سے کہا کہ دیکھو بھئی وکیل سے تو سچ سچ دل کا حال بیان کرتے ہیں۔ تم سچ سچ بات بتاؤ۔ یہ سُن کر موکل صاحب نے مجھے اچھی طرح سمجھا کر کہا کہ جو واقعہ بیان کیا ہے اُس میں قطعی شک کی گنجائش نہیں اور یہ کہہ کر اور بھی تفصیل کے ساتھ مفرورہ کے معاشقہ کی داستان سُنائی۔ قصّہ پر میں نے یقین کر لیا۔ مفرورہ سے جرح کی تو اس سے بھی یہی اندازہ لگا کہ ضرور بالضرور لڑکی ملزم پر عاشق ہوئی۔ واقعات مقدمہ سے بھی اُس کی تائید ہُوئی اور وہ بھی اس طرح کہ مقدمہ میں کامیابی کی قطعی اُمید ہو گئی اور بحث اب تیار ہو رہی تھی۔ یہ تو سب کچھ ہو گیا۔ لیکن جس روز سے یہ مقدمہ آیا میں خود ایک رنج و فکر میں پڑ گیا۔ ممکن نہیں ہے ورنہ میں اپنا اور ملزم کا فوٹو پیش کر کے ثابت کر دیتا کہ حضرت میں اپنے موکل سے ہزار درجہ خوبصورت ہوں۔ وہ ادھیڑ ہے اور میں نوعمر ہوں۔ مگر واقعہ

یہ ہے کہ بدقسمتی کچھ اس طرح شامل حال رہی ہے اور رہیگی کہ دُنیا زمانہ پر، کانے کھُتروں پر۔ نکٹے کانوں پر تو ایک سے ایک پری نژاد اور حور شمائل لڑکی عاشق ہوجائے اور نہ ہو تو ہم پر۔ جب کبھی بھی اس بات پر غور کیا افسوس ہی کرنا پڑا۔ بجائے اسکے کہ کوئی خدا کی بندی عاشق واشق ہوتی۔ اپنی زندگی کا تجربہ بدقسمتی سے یہ رہا ہے کہ خوبصورت اور بدصورت لڑکیوں کے تلخ اور کڑے چھبتے جملہ ہی سُننے میں آئے ہیں اور وہ بھی ایسے کہ جی تو ہمیشہ یہی چاہا کیا کہ آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر ایک پانچ ...... روزانہ مارے جائیں۔ آپ کسی سے پوچھئے کہ کیوں بھئی کبھی تم پر کوئی عاشق ہُوا ہے ؟ تو جواب میں آپ ایک سے ایک دلچسپ داستان سُنیں گے۔ ہم نے بھی دیکھا دیکھی اسی قسم کے بالکل جھوٹے قصے گھڑ گھڑ کر دل سے اپنے یار دوستوں کو سُنائے ہیں۔ وہ بات اور تھی۔ لیکن اب یہاں اس مضمون میں مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اگر جھوٹ لکھونگا تو آپ لوگوں کا تو کچھ نہیں کہیں کوئی" اور" اُس قصّہ کو سچ نہ مان لے جو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ لہذا سچ سچ کہونگا۔ یہ بھی سُن لیجئے کہ کس طرح اس سچ بولنے کی ضرورت پڑ گئی۔

۲

جُمیا کے قصّہ پر جب ردّ و قدح ہوچکی تو کام کے بارے میں خانم نے پوچھا کہ کیا کر رہے ہو۔ میں نے اسکے جواب میں ہنس کر کہا کہ" ذرا مسے

سُنو" اور یہ کہہ کر ملزم کی طرف سے جو بیان تحریری ہیں نے داخل کئے تھے وہ پڑھ کر خانم کو سُنانا شروع کئے۔ یہ بیان سات صفحوں پر تھے اور شاید ایک افسانہ نویس وکیل کے قلم کے ہونے کی وجہ سے اس میں اور بھی دلچسپی آگئی ہوگی۔ خانم نے جو بیان غور سے سُنے تو کہنے لگی کہ یہ کسی رسالہ کے لئے مضمون لکھا ہے یا سچ مچ مقدمہ کے بیان ہیں۔

قصہ مختصر یہ بیان خانم نے بڑے غور اور شاید "عبرت" سے سُنے۔ میں ان بیانات کو سُنا کر خانم کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ بھی مجھے غور سے دیکھنے لگی۔ میں اپنے دل میں کیا سوچ رہا ہونگا؟ بخدا اندازہ لگائیے۔ اور میں نے دل میں یہ سوچا کہ یہ کیا سوچ رہی ہوگی۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ اِن بیانات پر مفرورہ اور ملزم کی صورت شکل پر خانم نے بحث شروع کردی یہ بحث ختم ہوگئی تو میں نے کامیابی کے ساتھ خانم کو احتیاطاً یہ بھی سمجھا دیا کہ مردوں کے لئے سچ مچ یہ قطعی ضروری نہیں ہے کہ ان پر عاشق ہونے کی تیاری کرنے سے پہلے خوبصورت لڑکیاں یہ دیکھیں کہ مرد خوبصورت ہے یا بدصورت۔ کانا ہے یا کھترا۔ بس اُنہیں تو تہیہ کرکے عاشق ہوجانا چاہیئے

خانم نے یہ قصہ سُن کر اپنی آنکھوں میں ایک دلچسپی کی چمک پیدا کرکے مجھ سے ہنس کر کہا کہ ایک بات تم سے قسم دے کر پوچھیں گے سچ سچ بتاؤ گے یا نہیں؟

میں نے کہا: "وہ کیا؟"

وہ بولی: "پہلے وعدہ کرو۔ قسم کھاؤ۔"

میں نے فوراً خدا کی ایک موٹی سی قسم کھائی تو وہ بولی کہ: "یوں نہیں۔ ہماری قسم کھا کر وعدہ کرو۔"

مجبوراً یہ قسم بھی کھائی۔ ویسے تو نہ کھاتے مگر اس وقت سوال معلوم کرنے کی کُرید پڑ گئی۔ جب قسم کھالی تو اُس نے ذیل کا "ہنگامہ پرور" سوال کر دیا:۔

"سچ سچ بتانا۔ کبھی تم پر کبھی کوئی لڑکی عاشق ہوئی ہے یا نہیں؟"

مندرجہ بالا سوال نے مجھ کو کس کشمکش و پنج میں ڈال دیا ہوگا! ذرا اندازہ لگائیے۔ اپنی رفیق زندگی کی قسم کھا کر جھوٹ بولنا ناممکن۔ اگر سچ سچ کہتا ہوں تو معاملہ بگڑا جاتا ہے۔ کیونکہ صحیح اور امرِ واقعی جو پوچھئے تو وہ یہ ہے کہ ہمیشہ اسی تمنّا میں رہے کہ کوئی ہم پر عاشق تو ہو۔ مگر یہ تمنّا کبھی پوری نہ ہوئی اور قسمت میں خوبصورت اور "بے صورت" لڑکیوں کے اپنے مردانہ حُسن کے بارہ میں۔ تلخ ریمارک۔ اور تکلیف پہنچانے والے جملے ہی اس تمنا سے عشق کی مکمل و مفصّل روئداد ہو کر رہ گئے جواب بھی کانوں میں گونجتے رہتے ہیں۔ مگر نہیں۔ میں نے شاید یہاں غلطی کی۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے اوپر بھی تین لڑکیاں عاشق ہوئی ہیں۔ ایک تو خود سر پکڑ کر قسمت کو رو رہی ہے یعنی صاحبہ

سوال۔ تو اس کا ذکر ہی جانے دیجئے۔ کہ وہ عاشق نہ ہو تو کرے بھی کیا۔ وہ مضمون ہے کہ "کھاؤ تو بینگن کا بھرتہ اور نہیں کھاؤ تو بینگن کا بھرتہ"۔ پچاس دفعہ غرض پڑے تو عاشق ہو ورنہ جانے دو۔ اس جھگڑے ہی کو چھوڑ دو۔ لہٰذا اس کو چھوڑیئے۔

دوسری جو عاشق ہوئی تھی اُس کے بارے میں عرض ہے کہ اُس کی یاد میرے دل سے کبھی نہیں مٹ سکتی۔ اُس کی دلچسپ یاد اب بھی دل میں تازہ ہے۔ اور رہے گی، تاوقتیکہ شریر بچے مچلنا اور ضد کرنا بالکل نہ چھوڑ دیں۔ کیونکہ صحیح عرض ہے کہ کچھ کچھ اسی کا حلیہ اور نقشہ بیان کر کے شریر بچوں کو ڈرایا جاتا ہے جب کہیں جا کے شریر تا! بوئیں آتے ہیں!

اب رہ گئی تیسری نیک بخت جو میرے اوپر عاشق ہوئی تو بد قسمتی سے اس کا قصہ اس لائق نہیں کہ کسی اور کو یا بیوی کو سچ سچ سنایا جائے۔

چنانچہ مندرجہ بالا امور کو مدنظر رکھتے ہوئے میں خانم کے جواب سے کچھ چکرا سا گیا۔ کیا جواب دوں؟ یہ فکر دامنگیر ہوئی، سچ کہنا نہیں چاہتا تھا اور جھوٹ ناممکن تھا۔ لہٰذا میں نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے وقت گذاری کے لئے بجائے جواب دینے کے یہی سوال اُلٹا خانم سے کر دیا کہ پہلے تم بتاؤ کہ تم پر بھی کوئی عاشق ہوا ہے یا نہیں۔

یہ سوال سُن کر خانم کو ہنسی اور غصہ بہ یک وقت آیا۔ اُس نے

بُرا ماننے کی کوشش کی۔ مگر میں نے آڑے ہاتھوں لیا۔ یہ کہہ کر تمہیں ضرور بتانا پڑیگا ورنہ میں بھی نہ بتاؤنگا۔ جب میں نے زور دیا تو اُس نے صاف صاف کہہ دیا کہ خدا نہ کرے میرے اوپر کوئی عاشق کیوں ہوتا۔

مگر حضرت میں نے جرح شروع کردی اور ایک درجن بھی سوال نہ کئے ہونگے کہ خانم کو کہنا پڑا کہ میری شادی سے پہلے تین جگہ سے پیغام آدر آئے تھے۔ اُن میں سے دو کا تو خیر کچھ نہیں کیونکہ ان کو انکار کردیا تو وہ مان گئے لیکن ایک اُن میں سے روپیہ پیسہ والے بُڈھے صاحب تھے جنہوں نے زیادہ کوشش کی۔ لیکن اُن کو نہایت سختی سے انکار کیا گیا اور ان کی ہزاروں کی جائداد کے لالچ کو ہمارے خسر صاحب نے بڑی سختی سے ٹھکرادیا۔ چنانچہ قصہ سُن کر میں نے بُڈھے ہی کو پکڑا۔ اور جناب واقعہ بھی یہی ہے کہ اکثر بڈھوں کا قاعدہ ہے کہ اِدھر پڑ دس میں لڑکی پیدا ہوئی نہیں کہ انہوں نے چھٹی میں اُس کی شرکت کرکے اس کو دیکھا اور عاشق ہو گئے۔ پھر ٹھیک چودہ برس بعد آپ دیکھ لیجئیگا کہ بڑے میاں دھڑ دھڑ کے شادی کی کوشش کر رہے ہیں۔

جب اس بُڈھے والا قصہ ختم ہو گیا تو مجبوراً مجھے اپنا قصہ بے کم و کاست سُنانا پڑا۔ آپ بھی سُن لیجئے۔

عرض ہے کہ بعض اوقات لوگوں کو گھر سے بھاگ جانا پڑتا ہے تعلیم

ولیتم سب کو خیر باد کہہ کر۔ چنانچہ یہ خاکسار بمبئی میں اسی ضروری کام کے لئے گیا ہوا تھا۔ گھر سے بھاگنے والے بمبئی کو نہ معلوم کیا سمجھتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر پتہ چلتا ہے کہ گھر سے بھاگنا سراسر حماقت ہے۔ چنانچہ یہ اُسی زمانہ کا ذکر ہے کہ اس خاکسار کو بھی پتہ چل رہا تھا۔ یعنی ہوٹل کی نوکری سے کان پکڑ کر جو نکالے گئے تھے اُس کو پندرہ دن کے قریب گذرنے آئے تھے اور روپیہ جو کچھ بھی تھا وہ ختم ہونے والا ہی تھا۔ شام کو روزانہ کا میں نے یہ دستور بنالیا تھا کہ جو پاٹی چلے گئے اور وہاں سے سیدھے مالا بار ہل پر پہنچ گئے جیسکو ہینگنگ گارڈن۔ یعنی باغ معلق کہہ سکتے ہیں۔ آیئے میں پہلے اس باغ کی آپ کو سیر کراؤں۔

یہ باغ ایک مصنوعی اور کچھ غیر مصنوعی پہاڑی پر قائم ہے۔ یہ پہاڑی کیا ہے کہ سرسبزی اور شادابی کا گہوارہ ہے۔ اس کے دامن میں خوبصورت باغیچہ لگا ہوا ہے اور یہ باغیچہ پہاڑی کی ڈھلوان سطح پر برابر چوٹی تک اس خوبصورتی سے چلا گیا ہے کہ انسانی کاریگری کی داد نہیں دی جاسکتی جس طرح نینی تال۔ شملہ اور دوسرے ہل اسٹیشنوں پر چکردار سڑکیں بنی ہوئی ہیں جن پر ہو کر اوپر پہنچ جاتے ہیں۔ کچھ کچھ اس نمونہ کی پتلی پتلی سڑکیں۔ بارد شیں یہاں بھی بنی ہوئی ہیں۔ بیچ در بیچ سبزہ اور پھولوں میں ہوتی ہوئی یہ سنکڑوں روشیں پہاڑ کے ارد گرد کمر پیٹی کی طرح کسی ہوئی ہیں۔ راستہ میں جگہ جگہ بنچیں رکھی

ہوئی ہیں۔ پھولوں کی بھرمار ہے اور ان پُر فضا پتلی پتلی سبزہ اور پھولوں سے
لدی پھندی سڑکوں پر ہوتے ہوئے آپ چوٹی پر پہاڑ کی پہنچ جائیے۔ ہر سڑک
نیچے والی سڑک سے اونچی ہوتی گئی ہے۔ جگہ جگہ سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔
تاکہ اوپر والی سڑک پر آسانی سے پہنچ جائیں۔ شام کے وقت چوپاٹی سے
کھڑے ہو کر مالابار ہل کی طرف نظر ڈالئے۔ نیچے سے لیکر چوٹی تک خوشنما
پھولوں اور جھاڑیوں میں رنگین اور چمکیلے لباس والی عورتوں اور مردوں کی
آمدورفت یہ معلوم ہوتی ہے کہ گویا رنگارنگ کے پھول کھلے ہیں یا متحرک
تتلیاں سبزہ پر ناچ رہی ہیں۔ سامنے سمندر لہریں مار رہا ہے، خوشگوار
ہوا چل رہی ہے اور دیکھنے والا محسوس کرتا ہے کہ مالابار ہل پر ابدی نیکی اور
خوشی کا دیوتا رہتا ہے جو اپنے پجاری کو مقناطیسی قوت کے ساتھ اپنی
طرف کھینچ رہا ہے۔

میں نے بھی چوپاٹی پہنچ کر یہی محسوس کیا اور مالابار ہل پر پہنچا ہر
قدم پر بہار تھی اور ایک دلچسپ میلہ تھا کہ نازک اندامان بمبئی، خوش خرامان
بمبئی۔ حسینان بمبئی کے ساتھ ساتھ۔ پہلو بہ پہلو۔ اس دلچسپ پہاڑی پر خوش
فعلیوں۔ شرارتوں اور زندگی کی دلچسپیوں کا خاموش مطالعہ کرتے ہوئے ہم
بھی چڑھے چلے جارہے تھے۔ ہر قوم کی اور ہر عمر کی عورتیں اور مرد۔ ایک
سے ایک خوبصورت۔ ایک سے ایک شوخ۔ اور ایک سے ایک

پریزاد اور معصوم اس تفریح کے وقت پہاڑ پر چلی جا رہی تھی اور ہم بھی تھے پانچویں سواروں میں۔ خاموش طبیعت اندر ہی اندر سے باوجود اس تمام تفریح کے کچھ مردہ سی تھی۔ کوئی جان پہچان نہیں۔ کوئی یار دوست بات کرنیوالا نہیں۔

قصہ مختصر خاموشی کے ساتھ میں پہاڑ پر پہنچا۔ پہاڑ کی چوٹی ویسی نہیں ہے جیسی ہمالیہ کی۔ چوٹی پر پہنچئے تو ایک لق ودق سبزہ کا میدان ہے ایک باغ لگا ہوا ہے۔ پھول کھلے ہوئے ہیں۔ روشوں پر لوگ ٹہل رہے ہیں، سبزہ پر خوش فعلیاں ہو رہی ہیں۔ بس معلوم ہو رہا ہے کہ قاآنی نے اسی موقع کے لئے کہا تھا ع یکے برلالہ پا کو بد کہ ہے! ہے! رنگ مے دارد۔ جگہ جگہ یورپین۔ پارسی۔ مرہٹہ۔ گجراتی وغیرہ وغیرہ اقوام کی لڑکیاں اور عورتیں کچھ دوڑ رہی تھیں کچھ کھیل رہی تھیں، کچھ بچوں کے ساتھ جھولا جھول رہی تھیں۔ یہاں سرکار کی طرف سے جھولے پڑے ہوئے ہیں جگہ جگہ دو دو چار چار کی ٹولیاں سبزہ پر خوش فعلیوں میں مشغول تھیں۔ ہمارے جیسے شاید دو ایک احمق اور بھی تھے جو علٰحدہ ایک بنچ یا سبزہ پر بیٹھے ہوئے خوبصورت لڑکیوں کو بڑے غور سے دیکھے چلے جا رہے تھے۔ اور ادھر کوئی قریب سے خوبصورت لڑکی گذری نہیں کہ انہوں نے کوشش کی کہ کسی طرح جاذبِ نظر بن جائیں۔

—— ۴ ——

اِدھر اُدھر گھوم پھر کر میں اب تنہائی کے مقام پر پہنچا اور ایک بنچ

پر سر جھکا کر اس طرح غافل ہو کر بیٹھ گیا کہ تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند ہوگئیں تو یہ بھی خیال نہ رہا کہ کہاں ہوں، میں اسی طرح بیٹھا ہوا تھا کہ کچھ آہٹ سی ہوئی، میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دو پارسی لڑکیاں آپس میں باتیں کرتی میری ہی طرف چلی آ رہی تھیں۔ میری بنچ کے قریب آ کر ایک نے مجھ سے کہا۔ . . . . . . ''اگر کوئی مضائقہ نہ ہو تو کیا ہم بھی اس بنچ پر بیٹھ سکتے ہیں''

میں چونک سا پڑا۔ اور میں نے کہا ''ضرور۔ ضرور۔ بڑے شوق سے بلکہ میں خود ہی اُٹھ جاتا ہوں اور آپ ضرور بیٹھئے''۔

یہ کہتا ہوا میں اُٹھا۔ میرا اُٹھنا تھا کہ ''نہیں نہیں'' کہتی ہوئی بڑے اخلاق سے مجھے روکنے کو بڑھی اور بولی ''آپ بیٹھئے ہم خود چلے جائینگے'' فوراً ہی دوسری بولی ''ہم نے آپ کو تکلیف دی آپ بیٹھئے'' اِس پر میں نے اور بھی اصرار کیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ مضمون ہو گیا کہ ''واللہ آپ۔ واللہ آپ''۔ نہ تو میں راضی ہوتا تھا۔ کہ میں بیٹھ جاؤں اور وہ چلی جائیں۔ اور نہ وہ راضی ہوتی تھیں کہ وہ بیٹھ جائیں اور میں چلا جاؤں۔ نتیجہ یہ کہ ان میں سے جو ذرا بڑی عمر والی یعنی اٹھارہ انیس برس کی تھی اُس نے بڑے اخلاق سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی ''اچھا نہ آپ جائیے نہ ہم جائیں آپ بھی بیٹھئے اور ہم بھی بیٹھتے ہیں''

میں نے اس پسندیدہ تجویز پر دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا ''مگر

شاید میں آپ دونوں کے تخلیہ میں مخل ہوں گا"

اِس پر چھوٹی والی بولی "ہرگز نہیں بلکہ آپ کی موجودگی ہمارے لئے باعثِ دلچسپی ہوگی۔ کیا آپ ہماری بات چیت ناپسند کرینگے"

میں نے کہا "ہرگز نہیں"

قصہ مختصر وہ بھی بیٹھ گئیں اور میں بھی بیٹھ گیا اور اس کے بعد ہی اُنھوں نے بڑے اخلاق اور بڑے تپاک سے مجھ سے تعارف حاصل کیا۔ مجھے یاد نہیں میں نے اُن سے کیا جھوٹ سچ ملایا، جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ محض بمبئی میں سیر و تفریح کے لئے آیا ہُوا ہوں، اس کے بعد اُنھوں نے اپنا تعارف خود مجھ سے کرایا اور مجھے معلوم ہُوا کہ بڑی والی لڑکی بیوہ ہے اور چھوٹی اُسکی دوست ہے جو کنواری ہے، بڑی نے اپنا نام مسز لمجی بتایا اور چھوٹی کا نام مس رستم جی تھا۔ دونوں بہت خوش اخلاق، خوش پوشاک اور خوبصورت تھیں۔ مگر لمجی کو دیکھ کر اتنا ضرور کہنا پڑتا تھا کہ حضرتِ ڈارون کا مسئلہ ارتقا تو ضرور صحیح ہے مگر ایک بات ہے۔ وہ یہ کہ اگر حضرتِ انسان بندر کی اولاد کہے جا سکتے ہیں تو کچھ لوگ گھوڑے کی اولاد میں بھی ثابت کئے جا سکتے ہیں۔ بہت دیر تک یہ صحبت قائم رہی آخر میں خود ہی ان دونوں سے رخصت ہو کر دوسری طرف چل دیا۔

—— : ۵ : ——

شام ہو رہی تھی اور لوگ پہاڑ سے اُتر رہے تھے میری طبیعت حسبِ معمول کُند تھی چنانچہ بھیڑ بھڑکّے کو چھوڑ کر میں قصداً اس طرف چلا جدھر سے کوئی بھی نہیں اُتر رہا تھا اور روشوں کی تین منزلیں اُتر کر میں چوتھی پر پہنچا اور پھُولوں اور جھاڑیوں کے گنجان راستے طے کرتا ہُوا بالکل ہی تنہائی کے راستہ پر پہنچا اور وہاں سے میں پانچویں روش پر اُترا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مسز لمجی ایک گملے کے پاس ایک پیر جُھکائے اور دُوسرا پیر ایک جھاڑی میں پھنسائے اس طرح کھڑی ہے کہ منڈیر ہاتھ سے پکڑے اور چہرے سے تکلیف ظاہر ہو رہی ہے میں ایک دم سے اُسے دیکھ کر جھجک گیا اور وہ فوراً بولی کہ خدا کے واسطے میری مدد کیجئے میں فوراً اُس کے پاس پہنچا تو اُس نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا اور مجھے اُس وقت یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہُوا کہ نہ تو اُس کا کسی چیز میں کپڑا اٹکا ہے اور نہ پیر اٹکا ہے لیکن فوراً ہی اُس نے لنگڑاتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور گویا درد سے بیتاب ہو کر کہنے لگی "میرا پیر ٹوٹ گیا"۔ میں نے استفسار کرتے ہُوئے تسلّی دینا چاہی تو اُس نے بالکل ہی بے تکلّف اور آزادی سے اپنا داہنا ہاتھ میرے گلے میں اچھّی طرح حمائل کر کے اور مجھ پر لَد کر اپنا پورا بوجھ ڈالتے ہُوئے کہا کہ "براہِ کرم جس طرح بھی بن پڑے مجھے نیچے تک پہنچا دیجئے"۔

آپ خود خیال فرمائیں کہ میں کس طرح انکار کرتا جبکہ اس کہنے کے

ساتھ ہی اُس نے اسی شان سے کہ مجھ سے چمٹی ہوئی ہے اور گلے میں ہاتھ حمائل ہے لنگڑا کر میرے ساتھ چلنا شروع کر بھی دیا اور چار چھ قدم چلنے کے بعد ہی مجھے یہ معلوم ہُوا کہ یہ نسوانی بوجھ اس طرح گھسیٹنا میرے بوتے کا روگ نہیں لیکن اس عجیب و غریب تجربہ پر میں آپ سے کیا عرض کروں کہ میرے دل میں کیسے لڈّو پھوٹ رہے تھے۔

قصہ طویل ہے۔ مختصر اسکو یوں سمجھئے کہ تھوڑی ہی دیر بعد ہم دونوں ایک بنچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میری معلومات میں ایک نیا اضافہ ہوچکا تھا یعنی یہ کہ مسز لیجی مجھ پر بُری طرح عاشق ہوچُکی تھیں۔ نہ صرف اُنھوں نے مجھ کو مطلع کر دیا تھا بلکہ مجھے خود پتہ چل گیا تھا کہ یہ غریب میرے عشق میں بُری طرح مبتلا ہے اور اب اس کا علاج صرف یہی ہے کہ اس کی خواہش کے مطابق اس کے گھر چلوں یعنی اسکے مرحوم شوہر کے گھر جس کی اب وہ سولہ آنے خود مالک و مختار ہے اور اب اس مال و دولت میں اپنا شریک مجھے بنانا چاہتی ہے۔

اب ایسے موقع پر یہ سوال نہیں ہے کہ آپ ہوتے تو کیا کرتے یا کوئی اور ہوتا تو کیا کرتا بلکہ یہاں تعلق اس سے ہے کہ میں نے کیا کیا۔ میں نے یہ کیا کہ اُسے ساتھ لے کر نیچے اُترا چوپاٹی پر عجیب بہار تھی ہمیں اس سے کیا مطلب ہم نے تو جلدی سے ایک موٹر کرایہ کیا اور اُسکے گھر کی طرف

چلے ایک عالیشان بلڈنگ کے پاس اُس نے موٹر رکوایا ہم دونوں اُترے اُس کے پیر کا درد قریب قریب غائب تھا۔ تیسری منزل پر پہنچے۔ مگر اُس نے ایک بند کمرے کے دروازے کا تالا ہاتھ میں لے کر کہا "اب کیا کروں نوکر تالا دے کر چلدیا"

چار و ناچار ہم دونوں کو لوٹنا پڑا کیونکہ اُس نے بتلایا کہ نوکر دو گھنٹے بعد آئیگا میں نے پوچھا کہ آپ اب کہاں چلینگی تو اُس نے کہا "کچھ چائے اور آئیس کریم کھا کر سنیما چلئے"

مجھے بھلا کیا اِنکار ہو سکتا تھا۔ نیچے آکر میں نے پھر موٹر کرایہ کیا اور سیدھے اُس کی فرمائش کے مطابق اُس کی ایک ملنے والی کے یہاں چلے وہاں سے تین لڑکیاں اور ہمارے ساتھ ہولیں اور سب مِل کر ایک ہوٹل میں پہنچے کچھ کھا پی کر سیدھے سنیما گئے جہاں فرسٹ کلاس کے میں نے سب کے لئے ٹکٹ خریدے اور سنیما دیکھا۔ سنیما دیکھنے کے بعد صبح کا وعدہ کرکے ہم سب رخصت ہوئے۔

اب میں جائے قیام پر پہنچ کر اپنی جیب کا جائزہ لیتا ہوں تو پیر تلے سے زمین نکل گئی۔ مطلب یہ کہ بمشکل دو ڈھائی روپے رہ گئے۔

——— ۶ ———

دوسرے دن پہلا کام یہ کیا گیا کہ ساٹھ روپے کے قمیض کے بٹن

پچاس میں بیچے نہیں مگر پینتیس روپے میں رہن رکھ دئیے۔ یہ کیوں؟ محض اس لئے کہ عشق سے پہلا سابقہ ہے ذرا اچھی طرح نباہنا چاہیئے۔ بدقسمتی سے یا خوش قسمتی سے یہ سمجھے ہوئے تھے کہ بمبئی کے سیٹھ کی بیوہ سے شادی کرینگے اور سیٹھ کی دولت پر قبضہ جمائینگے۔ چنانچہ ۳۵ روپے جیب میں ڈال کر چلنے کی تیاری کی۔ آئینہ میں دیکھ دیکھ کر وہ وہ سنگھار کئے کہ آپ سے ہم کیا بتائیں بڑی دیر تک آئینہ میں اپنی صورت دیکھتے رہے اِدھر سے دیکھا اُدھر سے دیکھا اور ہر طرح اپنے کو قبول صورت اور صاحب جمال پایا۔ دل نے فوراً کہا کہ بھیّا مرزا دراصل تُو بہت خوبصورت ہے اور یہ جو شوخ اور خوبصورت چھوکریاں جن کے دماغ مغربی تعلیم نے خراب کر دئیے ہیں تجھ کو چمرخ پھٹیچر پنکی۔ تنکا۔ افیونی اور سنکیا پہلوان وغیرہ وغیرہ کہتی رہتی ہیں تو اصل میں جھک مارتی ہیں، اب تو تمہارے اوپر عاشق ہونے کا سلسلہ شروع ہُوا ہے اور اگر تم کچھ دنوں اَور بمبئی رہ گئے تو تعجب نہیں کہ حسینانِ بمبئی تمہیں تبرّک کر کے بانٹ لیں۔ ہم نے کہا کہ "اے بھیّا دل: اللہ تمہارا بھلا کرے۔ ہم تو کچھ کہتے سُنتے نہیں ہیں، مگر ہاں اتنا ہم بھی جانتے ہیں کہ بمبئی میں پرکھ والیاں کچھ ہیں ورنہ اپنی طرف کا تو حال یہ ہے کہ اچھوتوں کو چھوڑ کر ہمیشہ عاشق ہونے والیاں بُردں ہی کو ڈھونڈتی ہیں"

مسز لمجی کے گھر پر جو میں پہنچا تو اُس کو سڑک کے کنارے اپنا منتظر

پایا، میں اُترنے لگا تو وہ مسکراتی ہوئی خود موٹر پر چڑھ آئی اور شوفر سے کہا کہ رانی باغ چلو۔ شوفر نے موٹر کو پوری تیزی کے ساتھ چھوڑ دیا اور ہم دونوں باتوں میں مشغول ہو گئے۔ وہ وہ تجویزیں کیں اور وہ وہ خوشگوار خواب میں نے دیکھے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ مسز لمجی کے عشق حقیقی کی قدم قدم پر تصدیق ہوتی تھی۔

رانی باغ گئے اور وہاں سیر کی وہاں سے واپس ہوئے تو وہ اپنی ملنے والیوں کے یہاں لے گئی اور شام تک وہی پروگرام رہا جو گذشتہ دن رہا تھا اور اس پروگرام میں بائیس روپے ختم ہو گئے۔ اور اب مجھے فکر ہوئی۔ کہ روپے کا کچھ انتظام کرنا چاہیئے بمبئی میں میرے یار غار اور ہمدرد صرف ایک تھے بڑے یار باش۔ ضرورت سے زیادہ زندہ دل اور بڑے سچے ہمدرد یہ حضرت اودھ کے رہنے والے ایک نوجوان سید تھے اور ریلوے میں نوکر تھے چنانچہ میں اسٹیشن پر پہنچا تو انکو ریسٹ روم میں یار دوستوں کے ساتھ غپ شپ کرتے پایا۔ فوراً اُن کو ساتھ لیکر پُشت والے کمرے میں تنہائی میں لیجا کر اپنی رام کہانی شروع کی بہت تھوڑی سی سُنا پایا تھا کہ وہ ہنس کر بولے کہ "پھر آگے وہ لنگڑاتے ہوئے بھی تمہیں ملی یا نہیں اور اُس کو تم نے چلنے میں مدد دی یا نہیں"؟

ظاہر ہے کہ مجھے کتنا تعجب ہُوا ہو گا کہ میں نے اُن سے کہا بھی

نہیں اور اُنہیں معلوم ہو گیا۔ چنانچہ میں یہ سمجھا کہ شاید اُنہوں نے اُس کے ساتھ مجھے دیکھ لیا ہے چنانچہ ہنس کر میں نے کہا "تم کو کیسے معلوم ہُوا!"

اس کے جواب میں اُنہوں نے ایک زبردست قہقہہ لگایا اور ہنسی سے بیتاب ہو کر کرسی سے باوجود میرے پکڑنے اور روکنے کے اُٹھ کھڑے ہُوئے اور بڑے کمرے میں جہاں اور لوگ بیٹھے تھے پہنچ کر چلا کر کہا۔ "ارے میاں فاروق کچھ نئی سُنو"

فاروق ہنس کر بولے "کیوں بھئی کیا معاملہ ہے!"

اُنہوں نے میری پیٹھ پر زور سے ہاتھ مار کر ایک قہقہہ لگا کر کہا "اِن پر بھی مالابار ہل والی نے اُلو کی لکڑی پھیر دی"

اُن کا یہ کہنا تھا کہ کمرہ کا کمرہ مارے ہنسی کی آوازوں سے گونج اُٹھا بھڑوں کی طرح سب مجھے چمٹ پڑے، کوئی پوچھتا تھا کتنے روپے کھو بیٹھے، کوئی کہتا تھا ان کا وہ حال ہُوا کہ مفلسی میں آٹا گیلا۔ کوئی کہنے لگا کہ میرے یار تم نے اپنی صورت تو دیکھی ہوتی آئینہ میں کہ کوئی اس پر عاشق ہو ہی نہیں سکتا کوئی اور بولا کہ ان کے کان میں شیطان یہ کہہ گیا ہے کہ بھیّا تجھ سے زیادہ حسین کوئی نہیں وغیرہ وغیرہ۔ پھر ساتھ ہی حاضرین میں سے جو خود میری طرح تختۂ مشق بن چُکے تھے وہ بھی طرح طرح کی مسخری باتیں کرنے لگے نتیجہ یہ کہ جب اطمینان سے بیٹھ کر مجھ سے احوال مفصل پوچھا گیا

تو میں نے مجبوراً اپنی مُصیبت گھٹانے کے لئے نقصان کی میزان صرف سات روپے بتلائی اس کے بعد معلوم یہ ہوا کہ اِس چالاک عورت کا پیشہ یہی ہے کہ کسی احمق پر روز عاشق ہونا اور اپنا اُلو سیدھا کرنا۔

یہ وہ داستان ہے کہ ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم پر بھی عمر میں ایک لڑکی عاشق ہُوئی، اب یہ اور بات ہے کہ خود ہم نے ہی سلسلۂ عشق کو توڑ دیا اور پھر جتنے دن بمبئی میں رہے کبھی اُس طرف کا رُخ نہ کیا۔ اب دیکھیں اور کوئی بھی ہے جو اس مضمون کے عنوان نما سوال کا جواب دے۔
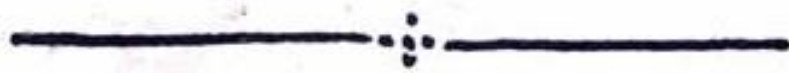
چند بیل

ایک بیل کو میں نے دیکھا کہ خاموش بیٹھا جگالی کر رہا ہے۔ آنکھیں نیم باز ہیں، اور ایک کُتا بڑی مشقت، تن دہی اور انہماک کے ساتھ اُسکے مُنہ کے سامنے کھڑا بھونک رہا ہے۔ بھونکے جا رہا ہے۔ بڑھ بڑھ کر بھونکتا ہے اور پیچھے ہٹتا ہے آخر جب کتا بہت قریب پہنچ گیا تو بیل نے زور سے "سوں" کر کے یوں سر ہلا دیا جیسے ہم آپ نفی کے طور پر سر ہلاتے ہیں۔ کتا پچھاڑ کھا کر بھاگا اور بدحواسی میں ایک آدمی سے جس کے سر پر ایک ٹوکرا تھا لڑ گیا اور ٹوکرا گر گیا۔ بیل خاموش بیٹھا جگالی کرتا رہا۔

ایک بیل کو میں نے دیکھا کہ اُس کے پیچھے ایک چھوٹا کتا اور دو عدد پاؤ ڈیڑھ پاؤ وزن کے پلّے دوڑ رہے ہیں بیل نے بدحواس ہو کر ہاکی فیلڈ کا رُخ کیا۔ ایک خوانچہ لوٹ دیا ایک بنچ مع لڑکوں کے پھاند گیا۔ میدان میں جب لڑکے دوڑے تو گول میں گھس پڑا، اس طرح کہ جالی توڑ کر پار نکل گیا۔ سوچتا ہو گا کہ آج بال بال بچے۔ کیونکہ کُتّے اُس سے الگ ہو گئے۔

ایک بیل کو میں نے دیکھا کہ اُدھر سے آ رہا ہے۔ اِدھر سے میں جا رہا تھا ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب سے گزرے۔ سردی کے دن تھے۔ وہ ٹاٹ کا اوورکوٹ پہنے ہوئے تھا اور میں اُون کا اورکوٹ پہنے تھا۔

ایک بیل نے (جس کا لقب سانڈ تھا) ایک چھوٹی سی بیل گاڑی پر حملہ کیا جس میں مَیں بیٹھا تھا۔ دو بیل گاڑی کے اور تیسرا یہ سانڈ۔ ان تینوں کی کوشش کیئے یا بدعنوانی سے نتیجہ یہ نکلا کہ گاڑی کا ایک پہیہ بڑے مزے سے ایک ڈیڑھ فٹ اونچی چبوتری پر چڑھ گیا۔ گاڑی ٹوٹ گئی۔ نیچے ہم لوگوں کے بھوسا رکھا تھا۔ چوٹ کم لگی مگر گت خوب بنی۔ سانڈ ادائے فرض کے بعد بھاگ گیا۔

ایک مرتبہ میں بیل گاڑی پر بڑی دور جا رہا تھا۔ ایک بیل موٹا تھا اور ایک دبلا۔ جو موٹا تھا وہ سست چلتا تھا اور مار کو بھی کسی شمار قطار میں نہ لاتا تھا۔ میں نے تنگ آ کر گاڑی والے سے کہا کہ اس کو خوب مارو۔ وہ بولا کہ اسے زیادہ مارا تو یہ فوراً نان کو اپریشن کر دیگا۔ اور چلتے چلتے بیٹھ جائیگا پھر چاہے کاٹ ڈالو مگر یہ نہ اُٹھے گا۔ مجھے یہ بات ناممکن معلوم ہوئی اور اُس کو پٹوایا۔ نتیجہ یہ کہ وہ بیٹھ گیا۔ اور بری طرح مارا اور کھڑا کرنے کی کوشش کی تو وہ ایٹ

گیا۔ اب قیاس میں آنا ناممکن ہے کہ کس کس طرح اُس کو مارا مگر نہ اُٹھنا تھا نہ اُٹھا
آنکھوں پر مارا، سینگوں پر مارا، مُنہ توڑ دیا، مگر وہ لیٹا رہا۔ جب میں ہار گیا تو
کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر دم لینے لگا کیونکہ مارتے مارتے تھک
گیا تھا۔ سگرٹ سُلگایا۔ گاڑی والے نے اپنی چلم سلگائی۔ نہ معلوم مجھے کیا
سوجھی کہ گاڑی والے کی چلم لے کر بیل کی دُم کے نیچے جلتی ہُوئی مُہر کی طرح
لگادی۔ میں آپ سے کیا عرض کروں کہ کیسے وہ تڑپ کر اُٹھا ہے کہ بیان سے
باہر، پھر لطف یہ کہ سولہ میل تک اُس کو ہر طرح مارا مگر پھر کبھی نہ بیٹھا۔ چند مہینے
بعد گاڑی والا پھر ملا اور کہنے لگا کہ بس ایک دفعہ اور لیٹ گیا تھا مگر وہی ترکیب
جو کی تو پھر کبھی بھُول کر بھی اُس نے ایسی غلطی نہیں کی۔

ایک بیل کی طبیعت خراب ہو گئی۔ یعنی ہماری اور آپ کی طرح زبان میں
چھالے پڑ گئے۔ ایک دیہاتی سول سرجن آئے جو ذات کے چمار تھے۔ اُنہوں
نے معائنہ کیا۔ تیل اور نمک طلب فرمایا۔ دونوں کو ملا کر ایک برتن میں رکھا۔
بیل کو پیر باندھ کر گرایا اور پھر زبان اُس کی باہر نکال کر ایک کھُرپے سے
زبان کے چھالے بُری طرح چھیلے۔ اُس کے بعد نمک اور تیل اچھی طرح زبان پر
ملا اور اُس کے بعد بڑی صفائی سے اپنا جوتا اُتار کر زمین پر اُس کا تلا رگڑ رگڑ کر زور
زور سے بیل کی زبان کو رگڑا۔ پھر چھوڑ دیا۔ بیل صاحب کھڑے کر دئے گئے

ناک میں زبان بار بار ڈال رہے تھے۔ آپریشن نہایت ہی کامیاب رہا بیل صاحب تیسرے ہی روز صحت یاب ہو گئے۔

ایک بیل صاحب کو میں نے دیکھا جن کی قیمت معلوم ہوا پانچ سو اسّی روپے ہے۔ وہ اس طرح پر کہ اسی روپیہ کے تو وہ خود تھے اور پانچ سو روپیہ کا نوٹ کھا گئے تھے اور کھا کر فوراً بھاگ گئے اور دن بھر نہ ملے ورنہ غالباً قتل کر دئے جاتے۔

ایک مرتبہ ہم لوگ شکار کو گئے۔ مستقر سے شکار گاہ تک بیل گاڑی سے پہنچے ایک مناسب مقام پر گاڑی چھوڑ دی اور شکار میں مشغول ہو گئے۔ ہم سب لوگوں کا اور بیلوں کا ناشتہ گاڑی میں رکھا تھا۔ ایک بیل صاحب اپنا ناشتہ کھاتے کھاتے ہم لوگوں کے ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سالن کی قسم سے جتنی چیزیں تھیں وہ زیادہ تر پھینک دیں۔ پراٹھے کُل کے کُل کھا لئے اور دسترخوان کھا رہے تھے کہ ہم لوگ بھوک پر دھار رکھے ہوئے کھانے کے لئے پہنچے جو ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیل صاحب دسترخوان کھانے میں مشغول ہیں درحالیکہ ہم گیارہ بھوکے یہ سوچنے لگے کہ دسترخوان پراٹھوں سے پہلے کھایا جاتا ہے یا پراٹھوں کے بعد۔ معلوم یہ ہوا کہ پراٹھوں کے بعد کھایا جاتا ہے۔ مر مر گئے

مارے بھوک کے۔ بس نہ تھا ورنہ جس نے ہمارا ناشتہ کھالیا ہم اس کا ناشتہ کھا جاتے۔ کچھ بھی ہو۔ یہ پتہ چل گیا کہ شکار اس کو کہتے ہیں۔

ایک بیل صاحب کے بے تکلف احباب میں سے ایک کتے صاحب خوش ہو جاتے اور دو پیر سے کھڑے ہو کر اُن سے گلے ملتے۔ جھوٹ موٹ اُن کے پیروں میں کاٹ کاٹ کر بھاگتے اور یہ تمام باتیں بیل صاحب خندہ پیشانی سے گوارا فرماتے بلکہ جواباً کتے صاحب کو محبت کی نظر سے دیکھتے صبح معمول تھا کہ بیل صاحب تشریف فرما ہیں اور اُن کے بے تکلف دوست صاحب اُن کے گلے میں باہیں ڈال کر اُن سے کھیل رہے ہیں۔ دوپہر کو کتے صاحب اپنے دوست کے بالکل ہی پاس آرام فرماتے تھے۔

آگرے میں ایک سانڈ صاحب ہیں۔ اُن کا دستور ہے کہ کسی مٹھائی کھٹائی کی دکان پر کھڑے ہو کر کھانا شروع کر دیا۔ اب لوگ مار رہے ہیں تو وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ محبت ہے۔ یعنی لوگ مار مار کر کھلا رہے ہیں۔ لہٰذا جہاں تک مار یا زور کی وجہ سے ہٹنے یا ہٹانے کا تعلق ہے۔ وہاں تک ہٹنے سے کیا مطلب۔ یہ اور بات ہے کہ اُن کے سامنے ہی سے چیز اُٹھا لی۔ چنانچہ جب میزبان کی اس طرح سے نیت معلوم کر لی تو پھر ٹھہرنا بیکار خیال فرماتے ہیں۔

ایک بیل ہیں بی اے "بیل والا" جن کا نام ایڈیٹر ہے اُنھوں نے ایک اعلےٰ درجے کا علمی و ادبی رسالہ جاری کر رکھا ہے اور لطف یہ کہ جنوری میں سالگرہ نمبر کا اہتمام بھی فرماتے ہیں۔ آپ کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ دسمبر کے پرچے میں ایک عجیب و غریب عنوان تجویز فرما کر میرا نام چھاپ دیا کہ ہمارے "مشہور مزاحیہ نگار" اس پر مضمون لکھیں گے۔ اور یہ مضمون جانوروں کے مطالعہ کا ایک دلچسپ باب ہو گا۔ اب آپ ہی کہئے کہ میں کیونکر اُن کے اس عجیب و غریب مطالبہ سے عہدہ برا ہوں۔

غُلیل

۱
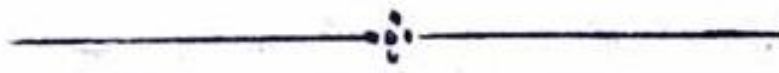
گرمی کا موسم تھا۔ دوپہر کا وقت۔ گلی بھی سُنسان تھی۔ خس کی ٹٹی کے سبب خُنکی تھی۔ اور بجلی کا پنکھا ایک رفتار سے چل رہا تھا۔ تمام دروازے بند تھے۔

چارپائی کے برابر فرش پر میرے میزبان کا لڑکا کھیلتے کھیلتے سوگیا تھا پاس ہی اُس کی ربڑ کی غُلیل اور غُلّوں کی تھیلی رکھی تھی۔

میں نے غُلیل کی طرف دیکھا "اس سے چڑیا مر سکتی ہوگی" میں نے دل میں کہا۔ اس کو اُٹھا کر دیکھا۔ ایک غُلّہ لیکر نشانہ باندھ کر دیکھا کہ اتنے میں سڑک پر سے آواز آئی۔ ع :۔

"گذر گیا ہے زمانہ گلے لگائے ہوئے"

ٹٹی کے بازو میں سے مَیں نے جھانک کر دیکھا۔ ایک جوان آدمی ایک رومال میں کچھ لٹکائے چلا جا رہا تھا گاتا ہُوا۔ جی میں آیا۔ اسے غُلّہ مار کر دیکھیں۔ قریب تو تھا ہی۔ سیدھ باندھ کر میں نے ربڑ کو خوب کھینچ کر غُلّہ مارا غُلّہ پشت

ہیں لگا اور گاتے گاتے وہ ایک دم سے رُک گیا۔ زمانہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" مڑ کر اُس نے اوپر دیکھا۔ ایک نظر پھر فوراً زمین پر غلّہ کی طرف۔ غلّہ اُٹھایا۔ غور سے غُلّے کو دیکھا اور ہاتھ میں غُلّہ لئے اب دیکھتے ہیں اوپر چاروں طرف۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ غُلّہ کدھر سے آیا۔ میری طرف سے کہ سامنے والے مکان کی چھت پر سے یا اُس کے برابر والی چھت سے۔ غلّہ ہاتھ میں لیکر دیکھ بھال کر چلدیا۔ گانا بند۔

——— ۲ ———

منٹ بھر نہ گذرا ہوگا کہ ایک کُتّے صاحب نظر پڑے۔ جاتے جاتے رُک کر بجلی کے کھمبہ کو حوائج ضروریہ کے مسائل کے انعقاد کے لئے منتخب فرمایا اور مراحل طے ہو رہے تھے کہ میں نے غُلّہ مارا۔ ہیں۔ ۔ ۔" کر کے مسئلہ مذکور کو التوا میں ڈال کر پہلے غُلّہ سونگھا۔ کہ میں نے ایک اور غُلّہ مارا۔ یہ پیر کے قریب ہی پڑا ایک دم سے اُچھل کر بھاگ گئے۔

——— ۳ ———

ایک گدھے صاحب آئے۔ یہ مٹھائی کا خالی دونہ نالی کے پاس نوش کرنے لگے کہ میں نے کس کر غُلّہ مارا جس جگہ غلّہ لگا تھا اس جگہ کی کھال کو قدرے جنبش سی دی اور بس۔ میں نے دوسرا غُلّہ مارا۔ اب جُنبش بھی نہ دی میں نے فضول سمجھا۔ چلے گئے۔

——— ۴ ———

دیر تک کوئی نظر نہ آیا تو میں پڑ رہا۔ پھر کوئی پندرہ منٹ بعد جو جھانکتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے نالی کے قریب نم زمین پر ایک کُتّے صاحب محوِ خواب ہیں۔ نالی کے اوپر چھوٹی سی پُلیا تھی جس پر دو سیڑھیاں مکان میں جانے کے لئے تھیں۔ اور اس کے قریب ہی کُتّے صاحب سوتے تھے میں نے نشانہ تاک کر ایک غُلّہ رسید کیا تو اُن کے کان کے پاس زمین میں لگا۔ ہڑبڑا کر یہ اُٹھ بیٹھے۔ معاملہ سمجھنے سے قاصر رہے۔ اچھی طرح سونگھا دیکھا بھالا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ بیٹھ رہے۔ کہ میں نے دوسرا غُلّہ مارا جو پیٹ میں لگا "میں" کر کے غلّہ سونگھ کر لگے اِدھر اُدھر دیکھنے۔ چاروں طرف دیکھا مگر پتہ نہ چلا۔ پھر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر گذرنے کے بعد میں نے پھر غُلّہ مارا تو اب کے انتظاماً بھونکے۔ مگر کس پر۔ غالباً خود جناب کو پتہ نہ تھا۔ اس کے بعد پھر گلی کی طرف شُبہ کیا۔ پھر اُس کے بعد خود پُلیا کے اندر دُشمن کا شُبہ کیا اور اُس کے بعد جو غُلّہ پڑا ہے تو یہ طے کر کے کہ ہو نہ ہو دُشمن پُلیا کے نیچے ہے لہٰذا قریب ہی کھڑے ہو کر انہماک اور جوش کے ساتھ آگے بڑھ بڑھ کر ایسے بھونکنا شروع کیا معلوم ہو کہ پُلیا اُڑا دینگے اور یہ حملے شباب پر پہنچے ہیں کہ میں نے آخری غُلّہ جو مارا ہے تو حملہ کی کارروائی مُلتوی کر کے جو بھاگے ہیں تو لوٹ کر نہ دیکھا۔

۵

ایک عورت گھونگٹ میں مُنہ چھپائے جاتی تھی۔ پُشت پر میں نے غُلّہ مارا۔ رُک کر مُڑی۔ بجائے اوپر کے پُشت کی طرف سڑک پر مُڑ کر دیکھا۔ غلّہ اُٹھا کر دیکھا۔ گھونگٹ سے نشانہ سا لگا یا اِدھر اُدھر۔ سمجھ میں نہ آیا کدھر سے غلّہ آیا۔ ذرا دیر ٹھہر کر مُڑ کر چلی جو سہی تو ایک آدھ ایکدم سے مُڑی۔ دُوسرے مکان کی بند کھڑکیوں کی سمت دیکھ کر بولی:" مجھے جو ابکی چھیڑا۔۔۔۔۔۔" بڑبڑاتی چلی گئی۔

——— ۶ ———

اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک عدد "علمائے کرام" چلا آرہا ہے۔ کندھے پر رومال ڈالے۔ نیچا سا کُرتا۔ میں نے غُلّہ جو مارا تو جسم کے بجائے کُرتے کے دامن میں لگا۔ رُک گئے۔ مُڑ کر دیکھنے کی ضرورت پڑی۔ غلّہ اُٹھایا ہاتھ میں غلّہ لیکر فرماتے ہیں اِدھر اُدھر دیکھ کر" کون ملعون ہے؟" اس تحقیقات ملعونیت کے سلسلہ میں جو مُڑے تو میں نے ایک غُلّہ پُشت پر عرض کر دیا بڑی پُھرتی سے گھوم کر تڑپ کر کہا" خبیث!" پہلے والا غلّہ ناپسند کر کے پھینک کر دوسرا غلّہ اُٹھایا کہ میں نے تیسرا رسید کیا۔ جوتے کے پاس زمین پر یہ غلّہ لگا۔ تڑپ کر مُنہ سے نکلا "مردود!" اور غلّہ پھینک کر لاحول پڑھتے روانہ مگر اس طرح کہ سمجھ میں نہ آیا کہ چلے گئے یا بھاگ گئے۔

——— ۷ ———

ایک لونڈا کوئی بارہ چودہ برس کا جا رہا تھا۔ غلّہ جو مارا تو خالی گیا۔ زمین پر پڑا۔ فوراً غلّہ اُٹھا کر تڑپ کر بھاگا۔ ہاتھ کی چونچ بنا کر ہاتھ ہلاتا ہُوا۔ واہ بیٹا........"

——— :: ۸ :: ———

ایک اور صاحب آئے گاتے ہُوئے "......سکھی ری نا مانے رے جیا مورا رے" میں نے ان کے بھی پُشت پر ایک غلّہ عرض کیا۔ ایکدم سے گانا بند کر کے بولے "کون ہے؟" غلّہ اُٹھا کر دیکھا "کون بدمعاش ہے" یہ کہہ کر سامنے والے مکان کے کوٹھے کی طرف شُبہ کر کے بولے "میں نے دیکھ لیا ہے" ہاتھ اُٹھا کر بولے "ہوش ٹھکانے کر دونگا"

"......گا......کرکے اُچھل پڑے کیونکہ میں نے پُشت پر ایک اَور غُلّہ عرض کیا۔ نیچے دیکھا اوپر دیکھا۔ پہلا غُلّہ ناپسند کر کے پھینک کے دُوسرا اُٹھایا۔ گالیاں دے کر لگے بِلبلانے۔ مگر یہ نہ سمجھ سکے کہ مارتا کون ہے۔ اس لئے کہ میری خس کی ٹٹّی سے ملا ہُوا چھجّا پڑوسی کا۔ اس کا دروازہ تو بند مگر کئی کھڑکیاں قریب ہی کھُلی ہوئی۔ ہماری بھی کئی کھڑکیاں کھُلی ہوئی۔ گالیاں تو دے رہے ہیں مگر یہ پتہ نہیں کہ کس کھڑکی کو۔ میں نے ایک اور غُلّہ مارا، وہ زمین پر پڑا۔ بھِر گیا تھا۔ گالیاں دے کر فرماتے ہیں "تیری ایسی کی تیسی۔ مجھے بھی کوئی وہ سمجھا ہے....." یہ کہہ کر اینٹ اُٹھا کر بڑے

زور سے دیوار پر مارتے ہیں اور اب میں نے چلائے غلّے۔ دو۔ تین۔ چار۔ پہلا خالی دوسرا خالی۔ تیسرا لگا۔ چوتھا خالی۔ پانچواں جو لگا تو ہاتھ کا ڈھیلا پھینک کے جو بھاگے ہیں تو مُڑ کر نہ دیکھا۔

—— ۹ ——

ایک خوانچے والے صاحب نکلے صدا لگاتے۔ دال سیو وغیرہ میں نے خوانچہ پر غُلّے لگانے شروع کئے۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ ایک بجائے خوانچے کے خود اُن کے لگ گیا۔ "ارے کون ہے۔ یہ کون"! کھڑے خوانچہ لئے بغل میں مونڈھا، گھوم رہے ہیں۔ لگا جو غُلّہ تو خفا ہو کر خوانچہ مونڈھے پر رکھ کر واللہ اعلم کیا ارادہ ہو گا کہ ہوئی جو خوانچے پر اولوں کی بارش، ایک۔ دو۔ تین۔ تو "ارے۔ ارے" کہہ کر خوانچہ سر پر دھر کے اس زور سے بھاگے ہیں کہ میں تعجب کرتا رہ گیا کہ خوانچہ لیکر بھی آدمی اتنا تیز بھاگ سکتا ہے۔

—— ۱۰ ——

اس کے کوئی پندرہ منٹ تک کوئی آیا ہی نہیں کہ ایک صاحب گردن جھکائے مسکین صورت بنائے چلے جا رہے تھے۔ میں نے کس کر ایک غُلّہ پُشت پر جو دیا ہے تو بدن میں چستی آگئی۔ غُلّہ ہاتھ میں اُٹھا کر حسرت سے مسکین صورت بنا کر چاروں طرف دیکھ کر بولے:۔

"بھلا یہ بھی کوئی بات ہے"!

سامنے والے مکان کے مکیں نہ معلوم کیا پکارے۔ جواب میں ان حضرت نے کہا:۔

"صاحب یہ بھی کوئی بات ہے کہ راستہ چلتے غریبوں کو ستانا۔"

اُنہوں نے کچھ نہ سُنا۔ دروازہ کھول کر بولے:۔

"کیا کہتے ہو؟"

وہ بولے: "کہتے کیا ہیں۔ یہ دیکھئے۔" غلّہ ہتیلی پر رکھ کر دکھایا۔

اَب میں بھی غلیل سے پورے فوائد اُٹھانے کے لئے تیار ہو گیا تھا میں نے سر نکال کر کہا۔ قبل اسکے کہ وہ حضرت کچھ جواب دیں۔ "صاحب ایسا نہیں چاہیئے۔ بے چارے سیدھے آدمی ہیں....... دیکھ بھال کے چلانا چاہیئے۔ اور جو آنکھ میں لگ جاتی تب۔"

راہگیر صاحب بولے: "دیکھ لیجئے آپ۔ میں تو کیا کہوں۔"

سامنے والے حضرت بولے: "کِنے مارا یہ غلّہ؟"

میں نے چلّا کر کہا "خوب!"

راہگیر صاحب بولے: "دیکھ لو صاحب، ایک تو غلّہ مار دیا پھر......"

مَیں نے کہا "اب جانے بھی دیجئے۔ لگ گیا دھوکے سے...." پھر سامنے والے حضرت کی طرف متوجہ ہو کر: "ارے صاحب کوئی بات بھی ہو۔ لگ ہی جاتی ہے۔ وہ بیچارے کب شکایت کرتے ہیں۔ ذرا دیکھ کر چلایا کیجئے۔"

راہگیر: "میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا"

سامنے والے حضرت تڑپ کر بولے "واہ صاحب واہ۔ میں جانتا نہیں غلیل چیز کیا ہوتی ہے آپ بھی غضب کرتے ہیں۔ قسم لے لیجئے مجھ سے...."

میں نے کہا "وہ بیچارے کچھ کہتے بھی ہوں۔ آپ قسمیں ناحق کھاتے ہیں" مگر توبہ کیجئے یہ حضرت قسموں سے باز نہ آئے۔ نتیجہ ظاہر۔ جس کے لگی اُس نے خود کہہ دیا کہ غلّہ کدھر سے آیا۔ مجبوراً کہتا گیا "بڑے افسوس کی بات ہے۔ میں کچھ بھی نہیں کہتا۔ ایک تو غلّہ مارا پھر جھوٹ بولتے ہیں"

ادھر پڑوسی صاحب نے قسموں کا تانتا باندھ دیا۔ میں نے بہت سمجھایا کہ قسمیں کھانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ بس احتیاط کافی ہے آئندہ کیلئے حتیٰ کہ ان حضرت کو میرے چہرے کی طرف اس طرح غور سے دیکھنا پڑا کہ گویا مجھے پاگل تصور کرتے ہیں۔

۱۱

شام کو میں ٹہلنے چلا گیا۔ بعد مغرب واپس جو آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ صاحبزادے پٹ رہے ہیں میں نے سفارش کی اور بچایا۔ معلوم ہوا کہ آج صاحبزادے صاحب نے یہ شرارت کی ہے کہ غلیل سے تمام راہگیروں کی خبر لے ڈالی۔

میں نے کہا کہ بچہ ہے۔ کیا مضائقہ ہے۔ آئندہ ایسا نہیں کریگا۔ پھر بچے کو بھی سمجھا دیا۔ میاں صاحبزادے غلیل کا شوق ہی ٹھیک نہیں ہے۔ اب تو شرارت نہیں کرو گے۔ اُس نے سر ہلا کر وعدہ کیا۔ میں نے کہا: مانگو معافی، تو بیچارے نے معافی مانگ لی، اسکے بعد میں دیر تک بچے کو سمجھاتا رہا لڑکوں کو چاہئیے غلیل دیکھ بھال کر چلایا کریں۔

فقیر

۱

ایک روز کا ذکر ہے کہ میں غسل خانہ سے نہا کر برآمدہ میں جو نکلا تو کسی فقیر نے سڑک پر سے کھڑکی کی چلمن میں شاید پرچھائیں یا جُنبش دیکھ کر صدا دی "مائی تیرے بیٹا ہوئے ....." درحالیکہ نہ تو یہاں کوئی مائی تھی اور نہ کسی کو یہ گھبراہٹ تھی کہ ایک عدد لڑکا خواہ مخواہ تولد ہوتا پھرے۔ دراصل یہ فقیر ان میں سے تھا جو مانگنا بھی نہیں جانتے۔ ذرا اس احمق سے کوئی یہ پوچھتا کہ بیوقوف یہ کونسی عقلمندی ہے کہ کسی سوراخ میں سے بھی کوئی ہلتی چیز دیکھ پائی اور بیٹا بیٹی تقسیم کرنا شروع کر دئیے۔ پھر مجھے فقیروں سے ویسے بھی بغض ہے کیونکہ جب کبھی مجھے کوئی فقیر ملتا ہے اور میں اُسے دیکھتا ہوں تو اُسے ایسا پاتا ہوں کہ مجھ سے دو کو کافی ہو۔ چنانچہ میں نے کھڑکی کی سلاخوں میں سے چق اُٹھا کر اس نیت سے دیکھا کہ اس سے یہ کیوں نہ پوچھا جائے کہ نوکری کرے گا۔

لیکن جب میں نے دیکھا تو ایک قابلِ رحم ہستی کو پایا۔ ایک فاقہ زدہ

ضعیف العمر، چیتھڑے لگائے بیکسی اور بے بسی کی زندہ تصویر تھا۔ سچ ہے ان لوگوں کو مانگنا بھی نہیں آتا۔ نہ تو یہ کوئی عمدہ گیت جانتے ہیں۔ نہ کوئی لَے جانتے ہیں، نہ صدا جانتے ہیں۔ بس لئے اور دانت نکال دئیے۔ یہ دکھانے کو کہ دیکھو ہم بھی اس دُنیا میں رہتے ہیں اور یُوں رہتے ہیں۔

مجھے اس کی حالتِ زار دیکھ کر بڑا رحم آیا اور میں نے اس سے کہا کہ گھوم کر صدر دروازہ پر آجائے۔

صبح کا وقت تھا۔ میں تو چائے پینے لگا اور گھر والی سے کہا کہ ایک انتہا سے زیادہ قابلِ رحم فقیر آیا ہے، اُسے دو چار پیسے دیدو اور صبح کا وقت ہے، دو توس اور ایک پیالی چائے دیدو۔

جتنی مشٹنڈے فقیروں سے مجھے نفرت ہے اُس سے دوگنی نفرت میری بیوی کو ہے اور اُسی مناسبت سے اُن فقیروں یعنی محتاجوں سے اُلفت ہے جو واقعی رحم و کرم کے مستحق ہیں۔

خانم نے فقیر کا سُن کر جلدی جلدی دو گرما گرم توسوں کو انگیٹھی پر سینک کر خوب مکھن لگایا اور ایک پیالی میں خوب بہت سا دودھ ڈال کر چائے بنا دی اور مزید برآں کچھ مٹھائی بھی رکھ دی اور سینی میں چار پیسے رکھدیئے اور لڑکے سے کہا کہ فقیر کو صدر دروازہ سے اندر یعنی برآمدہ میں بٹھا کر کھلا دے

اب قسمت تو ہماری ملاحظہ ہو کہ وہ غریب محتاج جسے میں نے بُلایا صدر دروازہ کی پُشت پر تھا۔ گھوم کر آجانا اُس کے لئے مشکل ہُوا یا آتے ہیں کسی دوسرے سے مانگنے لگا ہوگا یا پھر اپنی راہ کھوٹی نہ کرنا چاہتا ہوگا۔ قصہ مختصر وہ تو آیا نہیں اور اُس کے بدلے پھاٹک میں ایک اور فقیر صاحب داخل ہُوئے اور اپنی صدا لگانے بھی نہ پائے تھے کہ کُتّے نے اُن کا استقبال کیا، اُن کے پاس ایک موٹا سا ڈنڈا تھا، اُس کے دو چار ہاتھ نہ گھمانے پائے تھے کہ لڑکا ناشتہ لیکر پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک فقیر صاحب گلے میں مالا ڈالے۔ موٹا سا فقیرانہ ڈنڈا اور فقیرانہ لباس۔ گلے میں جھولی، ہاتھ میں چمل تہمد باندھے موجود ہیں۔ اُس نے کُتّے کو ڈانٹا اور کہا سائیں جی برآمدہ میں آجاؤ۔ سائیں جی نے غنیمت سمجھا اور ناشتہ شروع کیا اور ادھر میں نے خانم سے کہا کہ پُرانا سوئیٹر اور ایک قمیص فقیر کو اور بھیجدو۔ سردی کا وقت ہے اور غریب مر رہا ہوگا جاڑے میں۔ خانم نے جلدی سے ایک قمیص اور سوئیٹر پُرانا لیا اور لڑکے کو دیا۔ میں نے لڑکے سے پوچھا کہ فقیر کیا کہتا ہے؟ لڑکے نے کہا خوب دعائیں دے رہا ہے اور کھا رہا ہے۔ لڑکا قمیص اور سوئیٹر لیکر پہنچا اور وہ بھی فقیر صاحب کی نذر کیا، اتنے میں مَیں چائے پی کر باہر پہنچا تاکہ فقیر کو گرم کپڑے پہنتے ہوئے دیکھنے سے جو خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس سے لُطف اُٹھاؤں۔

۳

میں باہر پہنچا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ہٹا کٹا انتہا سے زیادہ مضبوط فقیر ڈکاریں لے رہا ہے اور سوئیٹر اور قمیص ہزاروں دعاؤں کے ساتھ لپیٹ کر جھولی میں رکھ رہا ہے۔ دراصل یہ مشٹنڈا صرف ایک سینہ کھُلی فقیروں والی کفنی پہنے تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صبح کی سرد ہوا سے لُطف اُٹھا رہا ہے۔ سینہ بالشت بھر اونچا۔ ڈاڑھی مُنڈی ہوئی، بلّے چڑھے ہُوئے۔ مجھے دیکھتے ہی حضرت لگے مجھُے دُعائیں دینے۔

اب میں آپ سے کیا عرض کروں۔ سارا کھایا پیا خون ہو گیا۔ جان سلگ کر رہ گئی۔ جی میں تو یہی آیا کہ اس کمبخت کا مُنہ نوچ لوں۔ ڈنڈا اور چمبل اُٹھا کر لگے حضرت دعائیں دے کر رخصت ہونے۔ دعاؤں میں مبالغہ اور غلو سے میری اور بھی جان جلی۔ اتنے میں خانم نے بھی جھانک کر دیکھا۔ وہاں بھی یہی حال ہُوا۔ اب بتائیے کیا کیا جا سکتا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ میں ان حضرت کو اس طرح ستم توڑ کر چلا جانے دوں۔ میں اسی شش و پنج میں تھا کہ میرے ایک دوست بھی آ گئے۔ میں نے دو لفظوں میں فقیر کی ستم آرائی بیان کی اور پھر فقیر سے کہا۔

"تمہیں شرم نہیں آتی۔۔۔۔۔۔"

سادہ لوحی تو دیکھئے کہ یہ حضرت اس ریمارک کو سُن کر اپنے تہمد کی طرف

متوجہ ہو کر محض میری جانِ حزین پر کرم گستری کے خیال سے ذرا نیچا کر لیتے ہیں
"کمبخت" میں نے اور بھی جل کر کہا" اتنے موٹے تنگڑے ہو کر بھیک
مانگتے ہو۔ بڑے شرم کی بات ہے"
اس کے جواب میں فقیر صاحب نے اپنے پیدائشی حقوق کا اعادہ کرتے
ہوئے اُن سے دست برداری سے معذوری ظاہر کی۔ اور اب میں یہ سوچنے
لگا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اس بدتمیز سے کم از کم سوئیٹر اور قمیص ہی چھین لی
جائے۔ میرے دوست نے کہا کہ یہ مناسب نہیں ہے مگر حضرت وہ جو
کسی نے کہا ہے ع "درد اُس سے پُوچھئے جسکے جگر میں ٹیس ہو"
میں نے کہا کہ خواہ اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے میں اس موذی کو یہ
چیزیں ہرگز ہرگز ہضم نہ ہونے دونگا۔ میں نے اب اُس محتاج کی تلاش
کرائی، ملازم اُسے تلاش کرنے گیا اور میں نے اِدھر فقیر صاحب کو لیا آڑے
ہاتھوں۔ میں نے کہا:۔
"تم نوکری کیوں نہیں کرتے"
وہ کچھ جل کر بولا "آپ ہی رکھ لیجئے"
مَیں نے فوراً رضامندی ظاہر کی اور دس روپے ماہوار اور کھانا
تجویز کیا۔ فقیر صاحب اس کے جواب میں بولے:۔
"اور گھر والوں کو زہر دے دوں"

میں نے کہا "کیوں؟"

وہ بولا "آپ دس روپیہ دیتے ہیں۔ ڈھائی آنہ روز کا تو گائے رزقہ کھاتی ہے اور ایک بیوی اور تین بچے۔ پانچ روپیہ میں گذر کیسے ہو"

گائے بھی ہے تمہارے پاس؟" میں نے متعجب ہو کر کہا۔

وہ بولا۔ "دو روپیہ مہینہ چرانے والا لیتا ہے۔ گائے نہ ہو تو صاحب کام کیسے چلے"

"کام کیسے چلے!" میں نے تعجب سے کہا "ہمارا کام کیسے چلتا ہے"

وہ بولا "صاحب آپ بڑے آدمی ہیں۔ ہم بھلا کہاں سے پیسہ لائیں جو روز تین سیر دودھ خریدیں"

"تین سیر!" میں نے متعجب ہو کر کہا "تین سیر! بھئی تین سیر کا خرچ کیسا"

معلوم ہوا خیر سے خود حضرت دو سیر دودھ یومیہ نوش کرتے ہیں میں پھر تنخواہ کے سوال پر آیا تو عسرت کی شکایت کرتے ہوئے تیس روپیہ ماہوار کا خرچ گھر کا بتایا اور قائل ہو کر کہا کہ اگر کم و بیش کسی روزگار میں اتنی کمائی ہو جائے کہ تنگی ترشی سے بھی گھر کا خرچ چل جائے تو فقیری چھوڑنے کو ابھی ابھی تیار ہیں!

اب میں اپنے دوست کی طرف دیکھتا ہوں اور وہ میری طرف

پھر معلوم ہوُا کہ حضرت دوپہر میں قیلولہ کے سخت عادی ہیں اور کسی صورت میں بھی دوپہر میں تو کام کر ہی نہیں سکتے۔ ویسے ہر طرح کوئی پیشہ۔ دھندا۔ نوکری غرض جو بھی بتاؤ اُس کے لئے حاضر ہیں۔ اب آپ ہی بتایئے میں اس موذی کو کیا جواب دیتا۔ میرا وہ حال کہ مرے پہ سو دُرّے۔ اتنے میں ملازم آیا۔ باوجود سخت تلاش کے وہ محتاج نہ ملا۔ اگر میرے دوست نہ ہوتے تو غالباً میں اس موذی سے ضرور کپڑے چھین لیتا۔ مگر میں نے اور ترکیب سوچی۔

—— ۴ ——

میں نے قطعی طور پر فقیر صاحب سے کہا کہ میں تمہیں اس حرامخوری کی سزا دئیے بغیر ہرگز ہرگز نہ جانے دوں گا۔ پچاس دفعہ کان پکڑ کر اُٹھو بیٹھو۔ اور خبردار جو پھر کبھی اس طرف کا رُخ بھی کیا۔

فقیر نے غصّہ کے شعلے میری آنکھوں میں دیکھے۔ ممکن ہے کہ یہی سوچا ہو کہ سوئیٹر اور قمیص دونوں بالکل ثابت ہیں۔ سودا پھر بھی بُرا نہیں نہایت ہی خاموشی اور سادگی سے آپ نے ڈنڈا اور پیالہ اپنا ایک طرف رکھا جھولی اور مالا اُتار کر رکھا اور تہمد اونچی کر کے کسنے لگے کہ میں نے ڈانٹا "بدتمیز ......" اس کے جواب میں وہ مجھے نہایت ہی مطمئن کر کے فرماتے ہیں "نیچے جانگیا پہنے ہوں" اور عذر کیا کہ اُٹھنے بیٹھنے میں تہمد مخل ہوگی۔

لیکن میں چونکہ سزا دینا چاہتا تھا للٰہذا میں نے اس کی بھی اجازت

دے دی۔ اب یہ حضرت ایک ہونکارے کے ساتھ بڑے زور سے ہونہہ" کر کے بغیر کان پکڑے ہوئے پہلوانوں کی طرح ایک سپاٹے کے ساتھ پاؤں سر کا کر بیٹھک لگا گئے۔

"بدتمیز۔ بیہودہ" میں نے جل کر کہا "یاد رکھو تمہیں پولیس میں دیدونگا کان پکڑ کر سیدھی طرح اٹھو بیٹھو۔"

دو دفعہ اُن کو میں نے کان پکڑ و اکر اُٹھنا بیٹھنا بتایا اور یہ حضرت سزا بھگتنے میں مشغول ہو گئے۔ یہ حضرت میری پشت کی طرف تھے اور ہم دونوں دوست فقیروں کو برا بھلا کہنے میں مشغول ہوئے۔

۵

ایک دم سے مجھے خیال آیا کہ "کان پکڑی" غالباً پچاس دفعہ ہو چکی مڑ کر میں نے دیکھا تو سُرعت کے ساتھ جاری تھی۔ میں نے پوچھا تو وہ بولا کہ ایک سو دس دفعہ کر لی۔ میں نے کہا "بس۔ بس۔ اب جاؤ میں نے تو پچاس دفعہ کو کہا تھا زیادہ کیوں کی۔"

وہ بولا "صاحب پانچسو بیٹھکیں روز لگاتا ہوں۔ میں نے سوچا کہ اب بار بار کون کرتا پھرے لاؤ یہیں پوری کر لوں۔"

"ارے!" میں نے اس کمبخت کو اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھتے ہوئے کہا "کیا تو پہلوانی کرتا ہے؟" واللہ میں نے گویا اب اس کو غور سے دیکھا۔ کان

ٹوٹے ہوئے سینہ اور شانہ اور پٹھے! خوب کسرتی بدن!

جواب دیتے ہیں۔ "پیسے نہیں کتا۔ شہر کے جس پٹھے سے جی چاہے لڑا لیجئے"۔

میں نے کہا "کمبخت۔۔۔ جی میں تو یہی آتا ہے کہ تیرا اور اپنا سر ملا کر لڑا لوں۔ نکل یہاں سے

ابھی۔ ابھی۔ نکل ۔۔۔۔۔ نکالو اسے"!

جلدی جلدی اُس نے اپنی جھولی وغیرہ اُٹھائی اور سینکڑوں دعائیں دیتا ہُوا چلا

گیا اور کمبخت مجھے انتہا سے زیادہ پست اور شکست خوردہ حالت میں چھوڑ گیا۔

اس موذی کا بخار میں نے اور فقیروں پر نکالا کسی کو نہ دیا، ڈانٹ کر بھگا دیا کہ ایک

عرصہ بعد کیا دیکھتا ہوں کہ کھڑے ملازم سے بحث فرما رہے ہیں وہ کہتی ہے کہ جاؤ آگے بڑھو

اور آپ فرماتے ہیں کہ ہمیں اس گھر سے ہمیشہ ملتا ہے، (لفظ ہمیشہ پر زور) اِدھر میں جو آیا تو فوراً

مجھے اس امر کی شہادت میں آپ پیش کرتے ہیں! اور ٹیپ کا بند "اللہ بھلا کرے کچھ سائیں کو بھی۔"

میں نے اُسے پکڑ لیا کہ آج تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ صحیح عرض کرتا ہوں کہ اس موذی سے

کوئی من بھر لکڑیاں پھڑوائیں چشم زدن میں پھاڑ پھوڑ برابر کیں اور میری کُرسی کے پاس آکر میرے

پیر دابنا شروع کئے اور "اللہ بھلا کرے"!

"ارے کمبخت چھوڑ" میں نے بیتاب ہو کر کہا۔ کیونکہ مجھے ایسا معلوم ہُوا کہ میری

پنڈلیاں کوئی لوہے کے شکنجے میں دھر کے داب رہا ہے۔

لکڑیوں کی پھڑوائی شاید دو آنہ دئے قمیص ایک اور مانگنے لگا۔ وہ نہ دی

تو بدمعاش کہتا ہے "بھوکا ہوں"!

میرا ارادہ ہو رہا ہے کہ اس غریب کو مسٹر برآس کے پاس اکھاڑہ ٹوکیو جاپان بھیج دوں

مزاحیہ ڈرامے

نوجوان ڈاکٹر

افرادِ تمثیل:۔ ڈاکٹر۔ کمپونڈر۔ مستری۔ چند مریض۔
منظر:۔ ڈاکٹر کے گھر کا ایک کمرہ۔

پہلا سین

کمپونڈر۔ (ڈاکٹر صاحب سے) چلئے نہ مطب میں۔ تین مریض بیٹھے انتظار کر رہے ہیں۔
ڈاکٹر۔ محض دق کرنے آئے ہیں یا کوئی کام کا بھی ہے۔
کمپونڈر۔ صورت شکل سے دو تو کام کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مدقوق صورتیں مگر تیسرا تو ہٹا کٹا ہے۔
ڈاکٹر۔ اور وہ ٹیلیفون؟
کمپونڈر۔ ٹیلیفون بدستور بگڑا پڑا ہے۔ حالانکہ ٹیلیفون آفس والوں کا

خط آیا تھا کہ کل ہمارا مستری آ کر ٹھیک کر جائیگا۔ مگر ابھی تک نہیں آیا۔

ڈاکٹر۔ مگر سُنو تو کیا ضرورت ہے ٹیلیفون کی۔ مفت میں مہینہ کے مہینہ
بھر مُٹھی روپیہ جاتے ہیں۔ آج تک کبھی ایک مریض بھی ٹیلیفون
کے ذریعہ نہیں آیا۔

کمپونڈر۔ مگر نہیں جناب۔ کوئی ٹیلیفون پر پوچھے یا نہ پوچھے کم ازکم جب
بیمار آ کر بیٹھتے ہیں اور آپ ٹیلیفون پر زبردستی کی گفتگو کرتے
ہیں تو مریضوں پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔

ڈاکٹر۔ یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ کیا یہ بہتر نہ ہو کہ ہم ایک مصنوعی ٹیلیفون
کا آلہ رکھ لیں۔ اب دو روز سے جب سے بگڑا ہے آخر کام چل ہی
رہا تھا۔

کمپونڈر۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ لہٰذا بہتر ہے کہ آج ہی خط لکھ بھیجئے ٹیلیفون
آفس کو کہ اب مستری اپنا نہ بھیجیں اور ٹیلیفون ہمارے یہاں سے
ہٹا لیں۔ مگر اب جلد چلئے مریض انتظار کر رہے ہیں اور میں کہہ کر
آیا ہوں کہ ابھی آتے ہیں مریض کو دیکھنے گئے ہیں۔

ڈاکٹر۔ (جماہی لیتے ہوئے) مریض تو سب مر گئے کمبخت۔ کہاں دھرے
ہیں مریض۔ تانگہ لے لو ایک۔

دوسرا سین

منظر۔ مطب میں چار پانچ مریض بیٹھے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب پہنچتے ہیں ٹیلیفون ایسا بگڑا ہے کہ بات چیت نہیں ہوسکتی مگر گھنٹی دیتا ہے مریض کھڑے ہوجاتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب ایسے کُرسی پر بیٹھتے ہیں جیسے کوئی گھبرایا ہُوا۔ اور بیٹھتے ہی آواز دیتے ہیں:۔

ڈاکٹر۔ کمپونڈر صاحب۔

کمپونڈر۔ جی۔

ڈاکٹر۔ دیکھئے۔ جس قدر جلد ممکن ہو اس مریض کی دوا اس کے گھر بھجوائیے اس کا آدمی آتا ہی ہوگا۔ مجھے ہر تین گھنٹہ بعد مریض کو خود دیکھنے جانا ہوگا۔ سب ڈاکٹر جواب دے چکے ہیں مگر میں نے تین دن میں اچھا کردینے کا ذمہ لیا ہے۔ آپ محنت سے کام کیجئے [illegible] روپے آپ کے انعام کے طے کئے ہیں۔ بس دعا کیجئے۔

کمپونڈر۔ انشاء اللہ۔ خدا نے آپ کے ہاتھ میں شفا ہی ایسی دی ہے۔ آخر احمد علی صاحب کو بھی تو سب ہی ڈاکٹروں نے جواب دیدیا تھا۔

(ڈاکٹر ہوشیاری سے میز پر ٹیلیفون کی گھنٹی بجاتا ہے ایسے کہ کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔ جھٹ سے ٹیلیفون کا آلہ ہاتھ میں لیتا ہے)

ڈاکٹر۔ ہیلو۔ پلیز۔ آپ کہاں سے بولتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آچ چھا۔ آپ ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آداب عرض ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہئے فرمائیے۔ راجہ صاحب اب کیسے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا اچھا خوب۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہیں! یہ کیوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میجر رسل۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدا کی مہربانی ہے شفا دینے والا وہ ہے میں کیا ہوں بھلا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تسلیم۔ تسلیم۔ مذاق کرتے ہیں شاید۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تو خدا کی شان ہے کہ میری تین خوراکوں میں فائدہ ہوا ورنہ میجر رسل مجھ سے کہیں ہوشیار ڈاکٹر ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جی۔ جی۔ خطرہ میں تو راجہ صاحب ضرور تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب ذرا ڈر نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہو ہی جاتی ہے غلطی۔ میجر رسل کیا بڑے بڑے ڈاکٹروں سے غلطی ممکن ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اوہوہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شکریہ شکریہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایسی جلدی آخر کیا تھی۔ خیر شکریہ۔ میرا اسلام راجہ صاحب سے کہہ دیجئے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کمپونڈر صاحب کو بھیجتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دس بجے بھیجوں گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہت اچھا آداب عرض۔

(ٹیلیفون کا آلہ رکھتے ہوئے مسکرا کر کمپونڈر صاحب سے)

ارے بھئی کمپونڈر صاحب۔ لیجئے مبارک ہو ذرا دس بجے یاد کر کے چلے جائیے گا۔ راجہ صاحب سے اپنا اور میرا انعام لے آیئے گا۔

پچیس روپے آپکو دئے ہیں۔ مجھے جو چاک دیں وہ لیتے آئیے گا۔ میجر رسل کا علاج چھوڑ دیا گیا۔

کمپونڈر۔ اجی ہیں تو پہلے ہی کتنا تھا کہ نام بڑا درشن تھوڑے، کیا جانے میجر رسل۔ اور جانے بھی تو شفا ہاتھ میں نہیں تو کچھ نہیں۔

ایک مریض۔ بیشک اگر شفا نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

کمپونڈر۔ اور تشخیص میں تو ڈاکٹر صاحب اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

(ڈاکٹر صاحب اب مریضوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں)

ڈاکٹر۔ کہئے آپ کو کیا شکایت ہے۔

(ساتھ ہی پھر چپکے سے ٹیلیفون کی گھنٹی بجادی اور ایکدم سے پھر آلہ اٹھالیا)

ڈاکٹر۔ ہیلو۔۔۔ جی ہاں۔۔۔۔۔ جی۔ جی۔ آداب عرض۔۔۔ کہئے دست آئے۔۔۔ اچھا۔۔۔۔ مگر نہیں صاحب میں اس وقت مریضوں کو چھوڑ کر کیسے آؤں۔۔۔۔ لاحول ولا قوۃ ڈبل فیس کیا بلا ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔ معاف کیجئے۔۔۔۔۔۔ میں ادنیٰ خادم ہوں سب کا مگر خود سوچئے میں اپنے مریضوں کو دیکھے بغیر کسی طرح بھی نہیں آسکتا۔۔۔۔۔۔ جی اصول ہے یہ میرا۔۔۔۔ بس آدھ گھنٹہ یا گھنٹہ۔۔۔۔ بشرطیکہ مریض کوئی نہ رہے۔۔۔۔ بس۔۔۔۔ میں خود۔۔۔۔

(مریضوں سے خود کہتا ہے)

بھلا بتائیے آپ لوگوں کو بغیر دیکھے کیسے چلد دں۔ کیسے کیسے آدمی ہیں۔ ہے ہیں ڈبل فیس لیلو مگر خود آ آؤ۔ لاحول و لا قوۃ۔

(مریض سے)

"ہاں تو آپ کو کیا شکایت ہے ؟"

مریض۔ جی میں مریض وریض کچھ نہیں۔ میں تو مستری ہوں بجلی گھر کا۔ آپ نے یونہی لکھ دیا کہ ٹیلیفون بگڑا ہُوا ہے۔ کل بھی لکھا۔ اور پرسوں بھی ناحق مجھے حیران کیا آپ نے۔

(جیب سے فارم نکالتا ہے)

دستخط کر دیجئے کہ تیغ علی مستری نے ٹیلیفون دُرست کر دیا اور اب کوئی خرابی نہیں ہے۔

(ڈاکٹر صاحب جلدی سے سر جُھکاتے ہیں، اور ایک گھبراہٹ کے ساتھ دستخط کر دیتے ہیں)

مستری۔ آداب عرض ہے۔ میری فیس کا بل بجلی گھر میں ذرا جلدی ادا کر دیجئے گا۔

ڈاکٹر۔ (زبان سے از خود نکلتا ہے) اچھا۔ اچھا۔ جلدی جائیے۔

(مستری چلا جاتا ہے)

ظفریات

سر سیّد بنام سانچی کا ٹوپ

مجھے جتنا ترقی اردو کا خیال ہے شاید ہی کسی دوسرے کو ہو۔ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ دن رات اسی دُھن میں رہتا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ کوئی راہ راست نظر نہ آتی تھی اور خود اپنی ہی "پانیر پرستی" ورغلا کر بنا بنایا کام بگاڑ دیتی تھی۔

— ۱ —

ایک روز کا ذکر ہے کہ تھکا ہارا آیا۔ بھوک کے مارے بُرا حال تھا۔ کھانا کھا کر آرام کرسی پر لیٹ گیا اور سوچنا شروع کیا۔ بڑی مصیبت یہ تھی کہ کوئی صلاح دینے والا نہ ملتا تھا جو مشورہ دیتا کہ مجھے اُردو کی ترقی کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ اسی طرح بڑی دیر تک سوچا کیا پھر رسالہ صوفی بابت ماہ مارچ دیکھنا شروع کیا۔

اندھیری رات تھی سناٹا چھایا ہُوا تھا۔ ایک عجیب ہُو کا عالم تھا۔ دُور

تک میدان ہی میدان چلا گیا تھا سامنے سانچی کے ٹوپ کا ہیبت ناک منظر تھا۔ مہاتما بدھ کے زمانہ کے راہبوں کی ہڈیاں انہی گنبدوں میں دفن تھیں۔ میں مہاتما بدھ کا بیحد قائل ہوں۔ میرے دل میں نہ معلوم کیا خیال گذرا کہ اس سناٹے کے عالم میں سانچی کے سب سے بڑے ٹوپ سے ایک گھٹی سی صدا آئی مجھے ایک پھریری سی آئی کہ پھر آواز آئی۔ آواز اس طرح کی تھی۔ جیسے گراموفون بجنا شروع ہوتا ہے فوراً ہی آواز بالکل صاف ہوگئی اور میں نے سُنا:۔

”سُن تجھے کیا کرنا چاہیئے۔ ہم دُنیا کے عقلمند ترین شخص ہیں تو ہماری سُن اور تیری ساری مُشکلیں آسان ہوجائینگی۔ تو مُسلمان ہے اور مُسلمانوں کی ترقی اور اُردو کی ترقی کا دلدادہ ہے۔ تو سن اور اس پر عمل کر:۔

سب سے پہلے تو تو اپنی خود کی کمزوریوں پر نظر کر۔ عمر تو نے انگریزی پڑھنے میں گنوائی۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ گیند میں اگر زور سے بلا لگتا ہے تو تو اس کو بجائے ”مار“ کے ”ہٹ“ کہتا ہے یا پھر اگر کہیں گیند ضرورت سے زیادہ دور جاکر گرتی ہے تو تو اس کو ”باؤنڈری“ کہتا ہے۔ کمبخت اس سے تو بہتر ہے کہ تو اسکو ”حدود اربعہ“ کہے۔ اگر آج تجھ ایسے نااہل اور بدخو یعنی علیگڈھ کے گریجویٹ بجائے انگریزی اور امریکن میگزینوں کے اُردو رسائل خرید خرید کر پڑھیں تو اردو کی جو ناگفتہ بہ حالت ہورہی ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سدھر جائے دراصل یہ تیریُ پانیر پرستی“ تمام بیماری کی جڑ ہے۔

وجہ دراصل بقول اس خاکسار کے (یعنی سانچی کے ٹوپ) یہ ہے کہ قصور اس میں بھی دراصل تیرا نہیں بلکہ تیرے باپ کا ہے نہیں بلکہ تیرے دادا کا جنہوں نے تیرے باپ کو گریجویٹ کرایا اور پھر انہوں نے تجھے انگریزی اسکول میں بھیجدیا۔ بجائے اسکے کہ تجھے کانپور کے عربی اسکول میں بھیجتے۔ اس میں تیرا ہی نقصان زیادہ ہوا۔ اگر تو کانپور یا بریلی میں یا کسی مسجد کے مکتب میں عربی اور قرآن پڑھتا تو تیرا ہاضمہ بھی درست رہتا اور آنکھیں بھی کمزور نہ ہوتیں۔ ایک تو یہ نقصان ہوا اور پھر انگریزی اسکول میں نالائق ماسٹروں نے تیرا اور بھی ستیاناس کیا۔ وہ یہ کہ دن بھر یہ نالائق ماسٹر یہی کوشش کرتے رہے کہ تجھے انگریزی آجائے دن بھر انگریزی بولتا اور پھر شام کو بھی پیچھا نہ چھوڑتا گیند کھیلنے کے وقت شام کو بھی وہی انگریزی۔ غرض اردو کا نام نہیں۔ اس طرح تیرا ستیاناس ان ماسٹروں نے کیا اور کیوں نہ ہو آخر یہ ماسٹر بھی تو کہیں کے عالم فاضل نہیں۔ یہ کون ہیں؟ وہی نا جو آئی۔سی۔ایس میں ناکام ہوئے پھر وکالت کی وہ نہ چلی تو ماسٹری کر لی انتہا درجہ کے خود غرض ہیں ورنہ ان ماسٹروں کو یہ چاہیئے تھا کہ بجائے انگریزی کے دن رات تجھے اردو سکھاتے زیادہ سے زیادہ ان کا کیا بگڑتا۔ یہی ہوتا کہ ماسٹری سے نکالدیئے جاتے تو کیا روٹی نہ ملتی۔ ارے میں کیا کہتا ہوں کہ کچھ نہ سہی نامہ نگاری ہی کر کھاتے تو وکیل نہ ہوتا کسی وکیل کا منشی ہی ہو جاتا۔ مگر کمبخت اردو کی خدمت تو

کر لیتا۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ انگریزی نہ پڑھنا بھی اردو کی ایک خدمت ہے
خدا بھلا کرے ان لوگوں کا کہ کچھ لوگ اسلامی درد رکھنے والے سر سید کے زمانہ
میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے بہت چاہا کہ لوگ انگریزی سے دور رہیں مگر
کفر اور الحاد کا زور تھا کسی نے اس وقت نہ سنا اب بیٹھ کر رونا روتے ہیں
کہ اردو ترقی کیسے کرے یہ بالکل غلط ہے کہ انگریزی نہ پڑھنے سے روپئیوں کے
لالے پڑ جائیں گے۔ خدا کے فضل سے ایک ریاست بھوپال ہی ایسی ہے
جہاں تمام دفاتر اردو میں ہیں اور مزے سے ملازمت مل سکتی ہے۔ ورنہ پھر ملک
خدا تنگ نیست اردو کی خدمت کرو اور اسی کے سر کھاؤ۔ یعنی مضمون نگاری کرو
غرض اردو جاننے والے کو کسی قسم کی دنیا میں دقت نہیں۔ وہ مزے سے کسی
ریاست میں مثلاً رامپور یا بھوپال میں چلا جائے۔ یہ مقامات ایسے ہیں جہاں
کے فلسفی بھی ہکسلے اور کانٹ کے فلسفہ اور ڈاردن کی تھیوری سے مستغنی ہیں
مسلمانوں کی حالت تباہ ہے اور یہ تمام انگریزی ہی کی وجہ سے ہے
تو دیکھتا نہیں کہ یہ لوگ (مع تیرے) صرف بی۔ اے اور ایم اے ہو کر رہ گئے
ہیں اور مردم شماری کے رجسٹر میں مسلمان لکھدئیے جاتے ہیں مگر قومی زندگی
اور قومیت کی تعریف سے اس لئے بیگانے دھرے ہوئے ہیں کہ نہ بی اے
کے مذہبی نصاب سے کوئی مسلمان قاضی۔ شہر ہو سکتا ہے نہ ایم۔ اے
کے عربی نصاب سے کوئی مسلمان آج تک کسی جگہ مفتی ہو سکا إلّا ماشاءاللہ

لہٰذا اگر تو مفتی ہو کر سوا روپیہ کے گھی کے عوض عمدہ عمدہ فتوے دینا چاہتا یا پھر سوا روپیہ فی نکاح کمانا چاہتا ہے یا مسجد میں اذان دے کر پیٹ پالنا اور جمعرات کی متبرک روٹیاں چاہتا ہے تو تجھ کو چاہیئے کہ تو اس "پانیز پرستی کو خیرباد کہدے۔ بس اس ذہنیت سے کنارہ کشی کرنے کے بعد سب کچھ ہو جائیگا۔ یہی دراصل اردو کی ترقی کا راز ہے۔ مگر مسلمانوں کی حالت واقعی تباہ ہے" سب سے زیادہ ذلت نصیب وہ مسلمان ہیں جو خود کو صاحبان علم معرفت اور ارباب فکر و خرد ظاہر کرتے ہیں اور جن کا کام قوم مسلمان کی رہنمائی اصلاح و ترقی اور نظم و تنظیم ہے۔ جو علم و ادب حکمت و بلاغت اور امامت و ریاست اور قیادت و خطابت کے مالک بنے ہوئے ہیں اور وہی ہو سکتے ہیں (اور کوئی نہیں ہو سکتا) جو ہندوستان کے اسلامی اخباروں اور اسلامی رسالوں کے مالک ایڈیٹر اور مینجر بنے ہوئے ہیں۔ مگر خدارا ان کی اس ذہنی ذلت و بربادی کے تماشے اور ماتم کے لئے تم شروع جنوری ۱۹۳۱ء کے اسلامی اخبارات اور اسلامی رسالے اٹھالو اور دیکھو کہ ان کے مرتب کرنے والے مسلمانوں نے اپنے مسلمان خریداروں اور مسلمان ناظرین کو اس خالص عیسوی سال کے آغاز پر کس پرجوش طریقہ سے مبارکباد دی ہے۔ ان پرچوں سے قطع نظر کر کے جو کسی زمانہ میں جنوری کے مہینے ہی سے جاری ہوئے ہیں تم دیکھو گے کہ تمام پرچوں نے اس

موقع پر کیسے کیسے خوشنما اور نظر فریب نمبر شائع کئے ہیں گو اس میں شک نہیں کہ بعض مقتدر اسلامی جرائد اس لعنت خیز حرکت سے محفوظ رہے مگر کس درجہ صدمہ ہوا ہے۔ سانچی کے ٹوپ کو جب اس نے مسلمانان ہند کے سب سے بڑے اور خالص اسلامی روایات کے حامل اعظم اخبار "زمیندار" میں سال نو کی مبارکباد پر ایک نظم کو شائع ہوتے دیکھا۔ اور اسلامی رسالوں کا تو شاید حساب ہی نہیں جنہوں نے دل کھول کر عیسوی سال کے آغاز پر اپنے سالگرہ نمبر شائع فرمائے **کاش انکے سالگرہ نمبر آغاز سال ہجری اسلامی پر شائع ہوتے** مگر یہ تو جب ہوتا کہ ان کے مالک اور ایڈیٹر درس قرآن و درس حدیث کی مکمل سعادت سے بہرہ ور ہوتے تو وہ خود بھی قومی خصوصیات کا احترام کرتے اور دوسروں کو سکھاتے مگر جو صبح سے شام تک نماز ایسے فریضہ اکبر و اکید سے دانستہ طور پر بے پروا ہیں جن کی آنکھوں کی تمام بصارت اخبار "پانیر" کے مطالعہ کے لئے حاضر ہو چکی ہو۔ وہ تو یہی کرینگے کہ "کرسمس ڈے" بھی منائیں اور "نیو ایرس" ڈے بھی اور لکھتے یوں ہیں کہ ہمارے اس اسلامی پرچہ کی امداد کیجئے"۔

—————— :: ۲ :: ——————

"سانچی کے ٹوپ" کا یہ لکچر میرے دل و دماغ میں بیٹھ گیا۔ ہڈی ہڈی میں نصیحت سما گئی اور میں سیدھا سانچی کے ٹوپ کی عظمت دل میں لئے گھر

کی طرف واپس آرہا تھا کہ راستہ میں کیا دیکھتا ہوں قطب مینار پر کھڑے سرسید ہوا کھا رہے ہیں۔ وہ بالکل تنہا تھے اور میں نے انکی طرف اس اندھیرے میں دیکھا۔ خدا کی قدرت کہ اس تاریکی میں رات کو سرسید قطب مینار پر براجمان تھے اور پھر طرفہ یہ کہ میں نے ان کو پہچان لیا۔ مجھے پکار کر بولے کہ "اے امام وقت تو کہاں جاتا ہے؟"

میں نے کہا "قبلۂ عالم اس نالائق کو آپ امام وقت کہتے ہیں۔ کیا یہ طنز نہیں اور پھر وہ بھی دادا کی طرف سے ایک پوتے کو"

سرسید نے زور دے کر کہا "تو کیا تو علیگڈھ کا گریجویٹ نہیں ؟ کیا تو علیگڈھ کے گریجویٹ کا بیٹا نہیں ؟ کل کی بات ہے کہ تیرے باپ نے میرے سامنے علیگڈھ سے بی۔ اے پاس کیا"

میں نے کہا "بیشک گریجویٹ ہوں بلکہ پوسٹ گریجویٹ کا بیٹا بھی مگر قبلہ ...... "

"بس! بس!" سرسید بولے "تو امام ہی نہیں بلکہ امام ابن امام ہے۔ اپنی ہستی کو دیکھ۔ کچھ خودی سیکھ۔ ذرا عجز سے بے نیاز ہو کر دیکھ کہ تو امام وقت نہیں تو اور کون ہے!"

اب میں چکرایا کہ یہ دادا میاں مذاق کر رہے ہیں اور میں نے کہا۔ "قبلۂ عالم ذرا تشریح فرمائیے کہ میں کس طرح امام وقت ہوں ؟

"سن" سر سید بولے "سن اور کان کھول کر سُن کہ تو امام وقت ہے۔ اور ہندوستان کے تمام علماء تیرے کمترین مرید اور پیرو۔ تو نے پہلے انگریزی جوتا پہنا تو ہندوستان کے مذہبی امام اور پیشوا چیخ اُٹھے کہ یہ کفر ہے مگر پھر خود انہوں نے پہنا۔ تو نے تصویر کھچوائی۔ بعد میں انہوں نے بھی کھچوائی تو نے پہلے انگریزی پڑھی بعد میں انہوں نے بھی پڑھی۔ تو نے پہلے تعلیم نسواں کی حمایت کی بعد میں خود یہ نام نہاد امام اپنی لڑکیوں کو پڑھانے دوڑ رہے۔ تو نے اب پردہ کو فعل قبیح کہا ہے اور یہ سب عادت لڑ رہے ہیں مگر کل دیکھ لینا یہ بھی پیری پیروی کرینگے۔ تو نے پہلے سود کے جواز کا فتویٰ دیا ہے کل یہ بھی تیرا ساتھ دینگے۔ تو امام ہے اور یہ تیرے کمترین مقتدی یہ قرآن اور حدیث کے حامل بنے ہیں تیرے ہر قول و فعل کو انہوں نے قرآن اور حدیث کی رو سے ممنوع بتایا اور اب وہی فعل جائز ہے۔ غرض میری یہ رائے ہے کہ تو ان کا امام ہے اور یہ تیرے مقتدی۔ جو تو آج کرتا ہے جھک مار کر یہ کل خود کرینگے اور کہیں گے کہ عین مذہب ہے"!

اتنا کہہ کر ذرا سر سید رُک گئے اور میں نے دل میں سوچا کہ واللہ دادا میاں کو بڑی دُور کی سُوجھی ہے مگر خیر سے یہ تو کچھ کچھ کفر پر آمادہ ہیں۔ نہ ہوئی ایک آدھ کفر سازی کی مشین چالو۔ کہ پھر سر سید گویا میرے دل کی بات سن کر بولے:۔

"ہاں یہ تو میں کہنا ہی بھول گیا کہ یہی وہ لوگ ہیں جو مجھے کافر کہتے تھے

بہر جمعیت زر حکم خدا رد کردی   ہیچ کافر نہ کند آنچہ تو سید کردی

اور اب یہی لوگ مجھے سب سے پہلے رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ میں اپنی آرامگاہ میں محو خواب ہوں مگر جتنے ڈاڑھی دار اور متشرع لوگ میرے مزار پر فاتحہ پڑھنے آتے ہیں ان کے نام نوٹ کرتا جاتا ہوں تاکہ دوزخ میں اگر جاؤں تو قیامت کے دن انہیں اپنے ساتھ لے لوں اور جنت میں جاؤں تو خیر۔ تو میرا مطلب یہ ہے کہ تو امام وقت ہے تو ان کی باتوں میں ہرگز نہ آئیو" پھر سر سید نے اسی لہجہ میں اپنی تقریر کو جاری رکھا۔

"میرے مخالفین میں سے بہت سے ایسے تھے۔ جو انگریزی کے خلاف تھے۔ انہوں نے مذہب کا واسطہ دے کر مسلمانوں کو انگریزی سے دور رکھا اور اردو ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اب میں نے سنا ہے کہ کچھ لوگ پھر پیدا ہو گئے ہیں جو اردو کا واسطہ دے کر کہتے ہیں کہ انگریزی مت پڑھو! اس ہندوستان دوزخ نشان کو چھوڑ دو مگر خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ سوائے یہاں کے دوسری جگہ بغیر جورسپرڈنس۔ فلسفہ جدید فلکیات اور دوسرے علوم جانے ہوئے نہ تو کوئی قاضی شہر ہو سکتا ہے اور نہ مفتی۔ ٹرکی میں جو شخص شیخ الاسلام کی حیثیت رکھتا ہے اس کے لئے لازمی ہے کہ وہ ایم۔ اے۔ یا ایل ایل۔ ڈی ہو اور مذہب کے علاوہ فلسفہ جدید اور جورسپرڈنس یعنی علم القوانین

کو جانتا ہو۔ لہٰذا تم اچھی طرح سمجھ لو کہ یہ علوم بغیر انگریزی جانے نہیں آسکتے۔ خدا وہ زمانہ جلد لائے کہ یہ علوم بغیر انگریزی جانے حاصل ہونے لگیں۔ مگر اب اس وقت بغیر انگریزی پڑھے چارہ نہیں۔ ہاں ان علوم کو تم اُردو چھوڑ کر بھی حاصل کرو۔ اردو کی یہی بہترین خدمت ہے۔ کہ وہ جن کی مادری زبان اُردو ہے۔ ان علوم کو جانیں کہاں تک اردو زبان متاثر نہ ہوگی۔ ان علوم کا اثر ضرور بالضرور اردو زبان میں آئے گا اور پھر خود یہ علوم آجائیں گے۔ یہی ترقی اُردو ہے اور یہی خدمت اُردو ہے۔"

میں نے عرض کی "قبلہ میں بصد ادب آپ سے اس معاملہ میں اختلاف کرتا ہوں"

"تم جلدی کرتے ہو" سرسید بولے "پہلے سن لو۔ بعد میں کہنا۔ ذرا تم خود غور کرو کہ بغیر انگریزی کے تمہارا کیا حال ہوگا منطق۔ فلسفہ۔ حکمت۔ ادب۔ تواریخ۔ علم ہندسہ۔ اقلیدس۔ جغرافیہ وغیرہ وغیرہ یہ تمام علوم تم کہتے ہو کہ اردو فارسی یا عربی میں موجود ہیں یہی کہتے ہو نا؟"

"جی ہاں۔ سب موجود ہیں"

بس یہی تو غلطی ہے تمہاری۔ ایک بھی علم موجود نہیں۔ اب سے ایک ہزار برس پیشتر ان علوم کا کیا حال تھا اور اب کیا ہے فلسفہ اور دیگر علوم کے

تمام نظریے باطل ہو گئے۔ غرض انگریزی کو اگر چھوڑتے ہو۔ تو تمہارے علوم کا یہ حال ہے کہ دنیا میں جو کچھ بھی علوم گذشتہ ایک ہزار برس میں پیدا ہوئے ہیں۔ ان سے بے نیاز ہو جاؤ کیونکہ تمہارے پاس کورس میں وہ کتابیں ہیں جو ہزار برس پہلے تصنیف ہوئی تھیں۔ اے امام وقت انگریزی پڑھو۔ علوم دنیا حاصل کرنے کے لئے بیشک انگریزی پڑھو۔ جس میں تمام دنیا کے علوم موجود ہیں۔ ایک ایک علم پر انگریزی میں تمہیں اتنی کتابیں ملینگی جتنی کہ اردو یا عربی کے تمام علوم کی موجود ہیں۔ پھر ارزاں ملیں گی اور ہر جگہ ملیں گی۔ ورنہ یاد رکھو کہ اگر تم نے انگریزی نہیں پڑھی تو تمہاری علمیت کا یہ حال ہوگا جو ظاہر ہے۔ یعنی ان کتابوں سے تم فلسفہ کے عالم بن کر جب نکلو گے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام فلسفہ تو انگریزی کے پانچویں جماعت کے ایک طالب علم کو معمولی معلومات یا جنرل نالج کے طور پر محض معلومات بڑھانے کے لئے پڑھایا جاتا ہے یقین نہ ہو مولوی کامل اور فاضل کے فلسفہ کا پرچہ اٹھا کر دیکھ لو اور کسی انگریزی اسکول کی پانچویں جماعت کے طالب علم سے پوچھ لو کہ دھنک کیسے نکلتی ہے۔ کہرا کیسے پڑتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اور پھر انگریزی نہ پڑھو گے تو مذہب کھو بیٹھو گے کیونکہ وہ علوم کہاں سے پڑھو گے جو ابھی ابھی ظہور میں آئے ہیں۔ مثلاً علم المعیشت جورسپروڈنس ایرو ناٹیکس (ہوائی جہازوں کے متعلق) ڈائنامکس وغیرہ۔ ویسے اردو عربی

میں ہیں تو سب مضمون اور علوم مگر جان پدر فرق صرف اتنا ہے کہ مثال کے طور پر فلکیات کو لے لو۔ متقدمین کے پاس ساڑھے سات من وزنی شیشہ والی دوربین کہاں تھی جو وہ فلکیّات کے علم میں ماہر ہوتے۔ تمام علوم فلکیّات موجودہ علم کے دیکھتے ہوئے ایسے رہ گئے کہ وہ علم کی ابجد کہلانے کے مستحق ہیں۔ اور بس یہی حال تمام علوم کا ہے۔ پھر انگریزی میں توتم کو دنیا کی کوئی ضروری کتاب نہیں جس کا ترجمہ نہ ملے بلکہ متعدد ترجمے نہ مل جائیں۔ لہٰذا تم میں اور غیر انگریزی دان عالم میں بڑا فرق ہے تم تمام وہ علم جانتے ہو جو انگریزی نہ جاننے والوں کی کتابوں میں ہے اور ماسوا وہ جو گذشتہ ایک ہزار برس میں وجود میں آیا اور ایک انگریزی نہ جاننے والا محض وہی جانتا ہے جو اردو یا عربی میں ہے تمکو فلسفہ کی ڈگری اس وقت تک نہیں ملے گی جب تک کہ تم علاوہ فلسفہ قدیم کے فلسفہ جدید کی تاریخ نہ پڑھ لوگے اور انگریزی نہ جاننے والا صرف فلسفۂ قدیم کی دو کتابیں پڑھ کر اپنے کو فلسفی کہنے لگیگا۔ اب دیکھا تم نے کیا فرق ہے تم میں اور ایک انگریزی نہ جاننے والے میں۔ یاد رکھو کہ جو شخص اپنے کو کسی فن میں عالم کہتا ہے اور اس فن میں نہیں جانتا کہ ہزار برس میں کیا کیا ترقیاں ہوئیں وہ عالم نہیں کہا جا سکتا۔ کیا تم اس شخص کو مورخ کہہ دوگے جو صرف اکبر تک کی تاریخ تک یاد کئے ہوئے ہو اور بعد کی تواریخ کے بارہ میں کہہ دے کہ یہ کیا واہیات ہے اس قابل ہی نہیں جو اسے پڑھا جائے ہمارے زمانہ کے بادشاہوں کا بعد کے بادشاہ کیا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ اسی طرح یہ انگریزی نہ جاننے والے کہتے ہیں۔

یہ فلسفہ جدید سب غلط ہے۔ واہیات ہے"۔ ذرا ان حضرات سے کوئی پوچھے کہ غلط تو ہے مگر آپ نے پڑھا بھی ہے ایک عالم کو تو غلط اور صحیح دونوں پر عبور ہونا چاہیئے۔ یہی حال تمام علوم کا ہے حتیٰ کہ مذہبیات کا بھی! عبرت! عبرت!!۔

لہٰذا اگر تم کچھ اردو کی خدمت کرنا چاہتے ہو تو انگریزی پڑھو۔ اردو ادب کو انگریزی سے مالا مال کردو۔ اپنا وقت زیادہ تر پاینیر پڑھنے میں صرف کرو اردو رسالے تم بالکل نہ پڑھو بلکہ اپنے ذمہ یہ خدمت لوکہ انگریزی سے ادبی جواہرات جمع کرکے اردو رسائل میں دو اور اردو داں پبلک کو اردو رسائل پڑھنے کی خدمت سپرد کردو۔ ہر کسے را بہر کارے ساختند۔ اگر یہ نہیں کروگے تو یاد رکھو کہ کبھی وہ زمانہ نہ آئیگا کہ تم انگریزی سے بے نیاز ہو جاؤ۔ اگر انگریزی سے بے نیاز ہونا چاہتے ہو تو انگریزی پڑھو علم بڑی چیز ہے جتنا بھی علم زیادہ حاصل کروگے اتنا ہی قرآن کے جواہرات تمہارے سامنے زیادہ روشن ہونگے یہ علم ہی تمہیں بتاتا ہے اور وہ بھی علوم جدید یعنی جورسپرڈنس اور علم المیشت کہ بعض مذہبی باتیں قرآن کی بجائے حدیث میں کیوں ہیں۔۔ مثلاً زکوٰۃ کی شرح قرآن میں کیوں نہیں۔ یہ بات نہ تمہیں دیوبند میں معلوم ہوسکتی ہے نہ بریلی میں بلکہ یہ بات تمہیں لندن میں معلوم ہوسکیگی یعنی علوم سے خواہ وہ کسی زبان میں ہوں ویسے تو معمولی ملا بھی تمہیں اس کی وجہ بتادیگا مگر وہ وجہ تو کنجڑا بھی جانتا ہے۔

غرض انگریزی نہ جاننے والوں کا یہ حال ہے کہ عربی تک نہیں جانتے
اگر تمہارے علیگڈھ کالج کا عربی کا پروفیسر ڈاکٹر ٹریٹن کسی ہندوستانی عالم سے
عربی بولتا ہے تو عالم صاحب کو پسینے آنے لگتے ہیں۔ حضور انور کے زمانہ کی
تحریر سامنے رکھتا ہے تو اس کو سنسکرت سمجھتے ہیں۔ تحریر کو دیکھ کر یہ تک
نہیں بتا سکتے کہ یہ بنو عباس کے زمانہ کی ہے یا بنی اُمیہ کے زمانہ کی۔ اسکے
منہ آتے ہیں جو عربی عبارت دیکھ کر اور عربی محاورات سُن کر بغیر کتاب دیکھے
بتا دیتا ہے کہ یہ فلاں سنہ کی عربی ہے فاعتبروا یا اولابصار اور پھر
اس پر طرہ یہ کہ انگریزی نہ پڑھو۔ سب علوم میں انگریزی نہ جاننے والوں کا
یہی حال ہے میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ اگر اردو کی ترقی چاہتے ہو تو
خواہ دن بھر انگریزی پڑھو کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اردو سے تمہیں محبت ہے"

سر سید اتنا کہہ کر ذرا رُکے اور بندہ اُڑنچھو۔

ایمان کی بات تو یہ ہے کہ سر سید نے مسلمانوں کا ستیاناس کر دیا اُس
ذہنیت کی پرورش کی جو انکی تقریر سے ظاہر تھی میں کنی دبا کر بڑے میاں
کے سامنے سے نکل آیا مجھے تو ساچی کے ٹوپ کی ہدایت پسند تھی۔ اب میں
میدان عمل میں گامزن ہُوا۔

——— : ۳ : ———

سب سے پہلے تو میں نے اپنے والد صاحب قبلہ کا ڈفرن میڈل" لیا

جو انہیں بی۔ اے میں ملا تھا۔ اور پھر اپنا "ٹول میڈل" لیا جو مجھ کو بی۔ اے میں ملا تھا۔ اور اس دو پشت کی نالائقی کے سرٹیفکٹ کو ہتوڑیوں سے کوٹ کر بہنا کر دُور پھینکا۔ مگر فوراً اُٹھانے دوڑا۔ کیونکہ آخر کو تو سونا تھا۔ خیر دونوں تمغوں کو کوٹ ڈالا۔ پھر اسکے بعد بی اے کی ڈگری کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ اور ایل ایل بی کی سند کو تو اور بھی بُری طرح پھاڑا اور جلا بھی ڈالا کیونکہ حضرت اس سے مجھے دشمنی نکالنی تھی جناب اس کے حاصل کرنے میں سو روپے ماہوار خرچ ہوئے تھے اور اب یہ آدھا روپیہ بھی نہیں دیتی تھی غرض اس طرح عملی جہاد کر کے اپنی انگریزی کتابوں اور رسالوں کی ہولی جلا ڈالی۔ ایک ایک کر کے تمام انگریزی کتابیں اور رسالے جلا ڈالے اب دل کو ٹھنڈک پہنچی فوراً اُٹھا کر اُردو رسالے پڑھنے لگا دو تین دن تک یہی حال رہا۔ مگر حضرت اب ایک اور مصیبت آئی۔ پیشتر تو وہ رسالہ اور میگزین پڑھتا تھا جن کی اشاعت کا یہ عالم ہے کہ باوجود قریب بائیس روپیہ سالانہ چندہ ہونے کے ماہوار اشاعت چونتیس لاکھ ہے۔ جب خریداروں کا یہ حال ہے تو مع مانگ کے پڑھنے والوں کے کیا تعداد ہوئی؟ پھر اسکے مضامین کا یہ حال معاوضہ کم از کم ایک گنی فی صفحہ سے لیکر زیادہ سے زیادہ ایک ڈالر فی لفظ تک ادا کیا گیا ہو مگر جناب مجھے تو سانچی کے ٹوپ کے احکام کی تعمیل کرنی تھی۔ مجھے تو پانیر پرستی کے الزام کو دھونا تھا۔ قہر درویش بجان درویش سمجھ کر پڑھا اور

خوب پڑھا۔ خبروں کے لئے انگریزی اخباروں کو لات مار کر اردو اخبار پڑھے جن میں دو روز کی باسی مگر خستہ خبریں پڑھنے میں آئیں۔ اب ان نامہ نگارانِ خصوصی سے سابقہ پڑا جو کوئی علم ہی نہیں جانتے اور جن کو کام کی اُجرت شاید دو آنہ کالم ملتی ہے ان کو چھوڑا جن کو پچاس روپیہ فی کالم اجرت ملتی ہے۔ مگر مجھے تو ترقی اردو کے لئے تمام صعوبتیں جھیلنا تھیں۔ جھیلیں۔

بہت جلد اب پیٹ کی پڑی۔ سوچا کہ مضمون نگاری کروں گا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ۔ ملا رموزی۔ شوکت تھانوی۔ پطرس اور رشید احمد صدیقی کا تتبع شروع کر کے مضمون لکھنا شروع کئے۔ یعنی مزاحیہ مضامین لکھنے شروع کئے۔ مگر حضرت کسی نے کہا ہے ع۔ ہر کسے را بہر کارے ساختند۔ تھوڑے دن تک واہ واہ ہوئی پھر لوگ تنگ آ گئے پھر پھر کر وہی بات۔ پھر وہی بات محض ایک قسم کے مضامین ایک قسم کا مذاق بہت جلد مجھے پتہ چل گیا کہ مزاحیہ مضمون لکھنا سب سے زیادہ مشکل ہے۔ اگر ہنسانے کی کوشش مزاحیہ مضمون لکھنے والا کرے اور اس میں ناکام رہے تو پھر اس سے قارئین کو نفرت ہو جاتی ہے۔ غرض اس میں سخت ناکامی اُٹھانا پڑی اور نااہل کر کے مجمع سے نکالے گئے۔ مُصیبت دراصل یہ ہوئی۔ کہ سنجیدہ رسالوں نے تو کبھی مُنہ ہی نہ لگایا تھا۔ خصوصاً ایسے رسالوں

نے جن کے خریداروں میں انگریزی دان زائد تھے کیونکہ یہ لوگ تو مارک ٹوائن۔ ڈکنس اور دوسری دنیا کے مزاحیہ نویسوں کے مضامین کی چاشنی چکھے ہوئے اور پھر مزاحیہ نویسی کے فن پر انگریزی کی بڑی بڑی کتابیں پڑھے ہوئے۔ غرض ایسوں نے تو منہ ہی نہ لگایا اور پھر طرہ یہ کہ ایک رسالہ نے میرے مضامین کو دیکھ کر میرے اوپر حسب ذیل پھبتی کسی:۔

"یہ اُردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ اسے اوندھا سمجھا جا رہا ہے اور بہٹی کا نام خوش مذاقی رکھ لیا گیا ہے۔ جہاں کسی نے ہی ہی ہا ہا شروع کی یا کچھ ٹوٹا پھوٹا لکھ لیا اور دربارِ صحافت سے مہمل خطابات عطا ہونے شروع ہوئے اس سے لٹریچر کو جو صدمہ پہنچا اس مسخرے (یعنی میرا) کا دماغ ہی خراب ہوا۔ ممکن تھا کہ آگے چل کر یہ کچھ ہو جاتا۔ اس بے وقت کی واہ واہ سے بچارا بنا بگڑا۔۔۔۔۔۔
کھینچ تان کے ایک دو کے سوا کوئی ایسا نہیں جسے مزاحی ادب کا صحیح ذوق ہو۔ ورنہ جسے دیکھو اندھے کی لکڑی ہے کبھی اوپر تو کبھی دلدل ہیں! اس پر ہر شخص سروان ٹیز اور مولئر کا مدعی! غریب نہیں جانتا کہ لکھنے پڑھنے میں ایک یہی چیز تو ایسی ہے جس میں انسان آسانی سے دھوکہ کھا جاتا ہے۔ خاصے بھلے چنگے پڑھے لکھوں کو (مجھ پر چوٹ ہے) آپ دیکھیں گے کہ اپنی پوزیشن گنوائے لیتے ہیں۔ ابھی ابھی اچھے تھے ابھی جو بہکے تو لگے منہ چڑانے۔ کبھی ظرافت کو بوجھوں مارتے ہیں۔ کبھی بھدا اڑاتے ہیں۔ کبھی شرابیوں کی طرح اچھی بھلی زبان

کو بگاڑ بگاڑ کر اونگی بونگی کہہ رہے ہیں انہیں دیکھتا ہوں تو اگلے وقتوں کے
درباری مسخروں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دربار اردو
کے یہ بھی ویسے ہی ہنستے چغل ہیں کہ ذرا کسی رسالہ نے انہیں چھیڑا اور انہوں
نے ادائی توائی باتوں سے کان کھانے شروع کئے اور اپنی بیوقوفی پر دوسروں
کو ہنسانا چاہا.........."

غرض جناب میں حیادار تھا گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ تھا تو کیا۔ بیحیا
ہوتا تو لکھتا رہتا۔ بس قلم پھینک اب ارادہ پختہ کرلیا کہ اپنا خود ایک رسالہ
نکالوں گا اور عمر اردو کی خدمت کے لئے وقف۔ چنانچہ یہی کیا اور رسالہ بھی
خوب چلا اور رُٹیاں نکلنے لگیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں سال بھر کے اندر
ہی اندر میں نے اپنی مشین اور پریس بھی خرید لیا۔

میں نے دیکھا کہ نیا انگریزی سال آیا تو تمام رسالوں نے سالنامے نکالے
نیرنگ خیال۔ ساقی۔ ہمایوں۔ عالمگیر۔ یہ ایسے پرچے تھے۔ جنہوں نے عیسوی
سال کی آمد آمد کی خوشی میں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر سالنامہ نکالا
میں نے بھی اپنے رسالہ میں ان کی خوب ہی خبر لی کیونکہ میں ساونچی کے ٹوپ
کا مرید تھا اور ساونچی کے ٹوپ نے اپنے لکچر میں دل کھول کر ان رسالوں کی

مزمت کی تھی۔ مگر جناب اس سے کام نہ چلا اور میرے رسالہ کے خریداروں نے بھی مجھ سے سالنامہ کا تقاضا کیا۔ چونکہ سانچی کے ٹوپ نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ اگر ایسا ہی سالنامہ نکالنا ہے تو اسلامی ہجری سال کے شروع ہونے کی خوشی میں نکالنا چاہیئے۔ تجویز اچھی تھی کیونکہ اس طرح عیسائی ہو جانیکا اندیشہ بھی جاتا رہتا ہے۔ چنانچہ میں نے بھی یہی ارادہ کیا کہ حسب ہدایت قبلہ سانچی کا ٹوپ میں سال ہجری کے آغاز پر اپنا سالنامہ نکالونگا۔ چنانچہ میں نے اعلان کر دیا بڑے بڑے مضمون نگاروں سے میں نے اس مخصوص سالنامہ کے لئے مضامین بہم پہنچائے۔ بڑی بڑی تیاریاں کیں اور تین مہینہ کی مسلسل کوشش کے بعد سالنامہ مرتب کیا۔ سالنامہ کیا تھا سال نو کی مبارکباد کا بہترین تحفہ تھا۔ سال نو کی آمد کے سلسلہ میں مبارکباد کی نظمیں تھیں۔ اور اس خوشی پر ناظرین رسالہ کو ہدیۂ تبریک پیش کیا تھا۔ میرا ایڈیٹوریل دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا ٹھیک سال ہجری کے نئے سال سے دو روز پہلے یہ سالنامہ ڈاک میں ڈالدیا گیا اور خریداروں کے پاس عین پہلی کو پہنچا۔

محرم کی ساتویں تاریخ تھی اور میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا اس فکر میں تھا۔ کہ سالنامہ کے تمام ریویو یکجا جمع کر کے پمفلٹ کی صورت میں شائع کر دونگا اسی سلسلہ میں رسالوں اور اخباروں کے ایڈیٹروں کو خطوط لکھ رہا تھا۔ دو تین

خط مشکل سے لکھے ہونگے کہ گلی کے نکڑ پر شور و غل سنائی دیا میں نے کچھ توجہ نہ کی کہ اتنے میں شور و غل بڑھنا شروع ہُوا۔ میں دروازہ پر آکر کھڑا ہُوا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شور بے ہنگام کے ساتھ نعرہ بلند ہُوا۔" یزید کو مارو" اس صدا پر سارا مجمع میرے دفتر کی طرف جھپٹا۔ یا اللہ میں نے گھبرا کر کہا یہ یزید کہاں سے آگیا۔ چشم زدن میں" یزید کو مارو یزید کو مارو" کا نعرہ مارتا ہُوا مجمع میرے سر پر آیا اور میں گھبرا کر دفتر میں بھاگا یہاں اب یزید میں ہی تھا۔ خدا کی پناہ! چھاپہ خانہ میں ایک تاریک سی کوٹھڑی سیاہی رکھنے کی تھی میں اس میں گھس گیا اور اُس مجمع نے میرا دفتر لوٹ لیا سارے رسالہ کا غذات وغیرہ پھاڑ ڈالے سڑک پر کاغذ ہی کاغذ اُڑ رہے تھے "یزید کو مارو" کے نعرہ پر میرا دل ہل جاتا تھا۔ مجمع دفتر لوٹ کھسوٹ کر چھاپہ خانہ میں گھس آیا۔ ساری مشینیں اور پتھر توڑ ڈالے آخر کار ڈھونڈ کر مجھے بھی نکال لیا" یزید کو پکڑ لیا ہے" کا نعرہ مجمع نے لگایا اور مجھے مارتے کوٹتے دفتر کی دو منزلہ چھت پر لے گئے وہاں میں نے کہا" بھائیو مجھے کیوں مارتے ہو؟" تو لوگوں نے مجھے لاتیں ماریں کہ موذی تو یزید ہے۔ تو نے عین محرم کے موقع پر اپنے ناپاک رسالہ کا سالنامہ نکالا ہے اور پھر خوش ہو ہو کر ایسے رنج کے موقع پر مبارک باد دیتا ہے میں نے کہا" بھائیو تم غور کرو کہ سالنامہ نکالنا مجھے ضروری تھا اور مجھے سانچی

کے ٹوپ نے بھی مشورہ دیا تھا" اس کے جواب میں انہوں نے میری گردن میں ایک رسّی کا پھندا ڈالا۔ ہاتھ پیچھے باندھ دیئے اور رسّی ایک کھمبہ میں باندھ کر دیوار پر مجھے کھڑا کر کے زور سے دھکّا دیا۔

میرے حلق میں جھٹکا لگا اور تڑپ کر میں نے زور مارا۔ لاحول ولاقوۃ۔ آرام کرسی پر سے گود کر میں سامنے کی چھوٹی میز پر جا پڑا تھا۔ آنکھیں مل کر چاروں طرف دیکھا کچھ نہیں صرف خواب تھا۔ ہاں صوفی ماہ مارچ ۱۹۳۱ء کا صفحہ ۵ البتّہ میرے سامنے کھلا پڑا تھا۔

اِنتہائے تحقیقات

پہلا رُخ

یہ شاید محکمہ آثار قدیمہ مصر کی خوش قسمتی تھی کہ بہت طول وطویل خط وکتابت کے بعد گورنمنٹ مصر دُنیا کے چند مشہور ترین اور قابل ترین ماہرین "مصریات" کی خدمات حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ جرمن پروفیسر ریختینیخ مشہور ماہر مصریات تھے اور ان کی امداد پر روح رواں عجائب خانہائے مصر مسٹر ڈمنیچ۔ مشہور ماہر مصریات اور پھر مسٹر لوٹو ایک انگریز ماہر مصریات قصہ مختصر جہاں یہ تین ماہر مصریات یکجا جمع ہو کر مصری قبروں کو اکھیڑیں تو یہ ناممکن کہ "ممی" کی سات پشت تک نام مع اعمالنامہ نہ پیش کر سکیں۔ آپ مصری کھنڈروں کا کتبہ کیسا ہی انکے سامنے پیش کر دیجئے وہ فوراً بتا دینگے کہ اس میں کیا لکھا ہے اور پھر یہ بھی کہ کس سن میں اور کس دن اور کے بج کر کے منٹ پر لکھا گیا۔ ان تینوں حضرات کو مصری گورنمنٹ نے محض اس وجہ سے بلوایا تھا کہ سنٹرل عجائب خانہ کے پاس سینکڑوں

پرانے کتبے اور بر آمد شدہ اشیاء ایسی ہیں ۔ جن کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کیسی ہیں اور کب کی ہیں لہٰذا یہ حضرات اس لئے آئے تھے کہ تمام چیزوں کا معائنہ کر کے اور جدید سائنٹیفک اصُول پر تحقیقات کر کے تمام کتبوں کو پڑھیں اور اُس کے ترجمہ سے دُنیا کو حیرت میں ڈالیں اور نیز مختلف اشیاء کے بارہ میں کچھ ارشاد فرمائیں تاکہ اس زمانہ قدیم کی معاشرت پر کچھ روشنی پڑ سکے ۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان تینوں حضرات نے اس کام کو کرنے کے لئے ایک ہزار پونڈ ماہانہ فی کس معاوضہ ٹھہرایا تھا۔

آخرش کام شروع ہو گیا۔ ایک لمبی چوڑی فہرست تھی جس کی امداد سے عجیب و غریب چیزوں کو اور پتھروں کے ٹکڑوں کو اُٹھا اُٹھا کر طرح طرح سے دیکھا گیا اور پندرہ بیس روز تک ان ماہرین نے صرف یہ کام کیا کہ ہر ایک چیز جو وہاں موجود تھی اس کو اُٹھا کر دوسری جگہ کسی دوسری کروٹ سے رکھ دیا۔ اِس کے بعد پھر اصلی کام کا نمبر آیا۔ کتبے تیزی سے پڑھے جانے لگے اور ان کی تاریخیں مقرر کی جانے لگیں۔ اشیاء برآمد شدہ کی ساخت پر روشنی ڈال کر ان کے نام رکھے جانے لگے۔

انگلش پروفیسر ڈاکٹر لوٹو نے اپنے کتّے کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک خاص چیز کے بارہ میں رائے دی۔ "یہ کتّوں کو دودھ پلانے کا برتن ہے۔" یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ انہیں کتّوں سے بیحد شوق تھا۔

"تو کیا آپ کی تھیوری یہ ہے کہ کتّوں کو بھی مصری لوگ پسند کرتے تھے؟"
ڈاکٹر ریختینغ نے کہا "میرا تو قطعی یہ خیال ہے کہ باوجودیکہ بلّی کی پرستش ہوتی تھی اور بلّی اور کُتّے سے سخت دشمنی ہے لیکن پھر بھی کچھ لوگ ضرور کُتّے پالتے ہونگے؟"

"اور وہ چھُپ کر پالتے ہونگے!" فرانسیسی ماہر نے کہا۔

"یا پھر ذی اختیار لوگ ایسا کر سکتے ہونگے" جرمن پروفیسر بولے۔

"اجی صاحب!" انگلش پروفیسر نے کہا "بعض اور لوگ بھی پوشیدہ طور پر کُتّے رکھتے ہونگے۔ آپ اس برتن کو کُتّوں کا کونڈا ہی قرار دیجئے" چنانچہ باتفاق رائے یہ تجویز پاس ہوگئی۔

اسی مہینہ میں ڈاکٹر لوٹو کی جدید تحقیقات یعنی "قدمائے مصر اور کُتّے" کا مضمون لندن کے ایک اخبار میں بڑے زور وشور کا نکلا جس میں بتایا گیا تھا کہ کس طرح تین پروفیسروں نے کتّوں کا ایک راتب کھانے کا کونڈا پایا ہے۔ جس کی تصویر بھی دی گئی تھی۔

اسی طرح دوسری چیز ہاتھ لگی "یہ تو صابن دانی ہے" ڈاکٹر لوٹو بولے۔
جرمن پروفیسر نے کہا "صابن! صابن دانی نہیں بھلا صابون کیسے......"

"اچھا پھر شمعدان لکھ دیجئے" فرانسیسی پروفیسر نے تجویز کیا۔

اگر اُس زمانہ میں سگرٹ نوشی رائج ہوتی تو بلاشبہ سگرٹ کا راکھ دان تو یہ بہترین ہے" یہ جرمن پروفیسر نے کہا۔ تینوں پروفیسر اس عجیب شکل کے برتن کے کام کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ فرانسیسی ماہر نے کہا" یہ عود دان ہے"

"عود دان! عود دان تو سینکڑوں ہر عجائب خانہ میں موجود ہیں۔ میری دانست میں تو اسے سنگاردان کا ایک خاص برتن قرار دیا جائے۔ کیوں ڈاکٹر لوٹو صاحب آپکی کیا رائے ہے"؟ جرمن ماہر نے کہا۔

ڈاکٹر لوٹو اپنے کُتّے سے کھیل رہے تھے کچھ چونک سے پڑے اور بے سوچے سمجھے بول اُٹھے"! میرا بھی ایسا ہی خیال ہے مگر الائچی دان کیسا رہیگا؟"

الائچی دان ہی لکھ دیجئے"! جرمن پروفیسر نے لاپروائی سے کہا۔ یہی ٹھیک بھی معلوم ہوتا ہے"! چنانچہ لکھ دیا گیا۔ اسی طرح ہر چیز کی تحقیقات کر کے فوراً بتا دیا گیا کہ کیا چیز ہے اور پھر اٹکل پچو ان کی تاریخیں بھی لکھدی گئیں کہ یہ کب بنے تھے۔ اس کے بعد پھر کتبوں کا نمبر آیا۔ سب سے پہلے تو جرمن پروفیسر ایک اینٹ کو یہ کہہ کر جرمنی لے دوڑے کہ وہاں برلن کے عجائب خانہ میں ایک نہیں بلکہ کئی کتبے ہیں جن کی امداد کے بغیر یہ نہیں پڑھا جا سکتا۔ اسی طرح بقیہ دو پروفیسر بھی دو تین چیزیں لیکر اپنے اپنے گھروں کو بھاگے۔ واقعہ بھی دراصل یونہی تھا کیونکہ موجودہ

مشہور عجائب خانوں کے بیش قیمت تحائف اکثر ایسے ہیں جو بعض اوقات مصری معاملات پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ لیکن ایک اور واقعہ بھی تھا کیونکہ موسم گرمی کا بھی آگیا تھا اور پھر مصر کی گرمی سے گھر کی گرمی کہیں زیادہ بہتر ہے۔

جب سب لوٹ کر آئے تو ہر ایک کی دریافت اور تحقیقات کی دُوسرے نے قدر کی۔ فرانسیسی نے جرمن اور انگریز ماہر کی تحقیقات کے بارہ میں ایک خاص بُلیٹین شائع کیا اور اسی طرح انگریز اور جرمن ماہر نے کیا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان رسالوں نے ماہر مصریات کی آنکھیں کھول دیں۔

اسی دَوران میں ایک امریکن ماہر مصریات بھی آنکلے اور انہوں نے ان میں سے ایک کتبہ کا فوٹو لے کر ایک علیحدہ بلیٹین شائع کر دیا۔ اور دُنیا کو مخاطب کر کے کہا کہ ڈاکٹر لوٹو نے جس کتبہ کو پڑھ کر دنیا کے سامنے پیش کیا اس پر کوئی کتبہ ہی درج نہیں بلکہ اس پر تو محض کُہنگی کے باعث کچھ نشانات ہیں اور بس۔ بدقسمتی سے ان پروفیسر صاحب کی خدمات کو مصری گورنمنٹ نے قبول نہیں کیا تھا۔

دُوسرا رُخ

"یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ چُکا ہے" پروفیسر آچاریہ نے اپنے لیکچر کے دوران میں کہا کہ "ہمارے آباواجداد یعنی قدیم ہند و مصر و عرب و شام و یمن

نہیں بلکہ یونان ور دیا پر قابض تھے اور اسی ہندوستانی تہذیب کا دُنیا میں دَور دَورہ تھا۔" (رچیرڈ) ایک عرب سیّاح خود کہتا ہے کہ دریائے نیل کا نام "نیل" دراصل ہندو نام ہے۔ باب المندب دنیا جانتی ہے کہ عربی مقام اور عربی نام ہے معنی یہ ہوئے کہ آنسوؤں کا دروازہ۔ وجہ اس کی یہ ہے اس آبنائے میں جہازرانی اِس قدر کسی زمانہ میں دشوار تھی کہ وہاں جہاز اکثر ٹوٹ جاتے تھے چونکہ پُرانے زمانہ کے ہندوؤں میں تصوّف کا اثر زیادہ تھا اور وہ موت کو زلیست سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ لہٰذا جب اُنکے جہازات وہاں شکست ہوتے تھے اور وہ مر جاتے تھے تو وہاں ہندو ملاحوں نے ایک ویران جزیرہ پر باب امن کا استھان بنا دیا تھا۔ ہوتے ہوتے وہ باب المندب ہوگیا اور مناسبت یوں پیدا ہوگئی کہ ملاحوں کے مرنے پر اُن کے عزیز آنسو بہاتے تھے۔ اسی طرح آپ دیکھ لیجئے کہ جزائر کے نام بھی آج تک ہندو ہیں۔ مثلاً سُماترا۔ اصل میں یہ یاترا کا مقام تھا اور یہاں یاتری لوگ بہت جاتے تھے امتداد زمانہ سے سماترا ہوگیا۔ اور پھر یہ لفظ بھی دراصل ہندی ہے لہٰذا یہ قطعی امر ہے کہ یاترا میں "سم" بھی ہندوؤں ہی کے زمانہ میں لگ گیا۔ جیسے "سمیکتا" جو مہاراج پرتھی راج کی رانی تھیں اسی طرح سماترا ہوگیا۔ اسی طرح لفظ بورنیو اصل میں لفظ برن کا بگڑا ہوا ہے۔ ہندوؤں کے بعد جو اور قومیں وہاں آباد ہوئیں۔ اُنہوں نے اسکو بورنیو کہا۔ اسی طرح بالی۔ یہ بالی ہی

صرف ایک جزیرہ رہ گیا ہے۔ جہاں آج تک ہندو دھرم موجود ہے۔ یا ہندوستان میں ہندو رہ گئے ہیں اور یا اُن جزائر میں سے بالی کے جزیرہ میں اسی طرح جزائر برموڈس بھی ہندوؤں کی نو آبادیات تھیں اور مہاراج برہم داس کی بسائی ہوئی تھیں مگر آج اس کا نام برموڈس کر دیا گیا ہے۔

امریکہ جس کو کولمبس نے دریافت کیا۔ دراصل خود ہندوستان قدیم کی نو آبادی تھی۔ چنانچہ پروفیسر زیبٹ نے ڈاکٹر غبپ کی امداد سے یہ امر پایۂ ثبوت کو اس طرح پہنچا دیا ہے کہ دریافت سے معلوم ہوا ہے کہ امریکہ کے جنگلوں اور پہاڑوں میں اب بھی اس قسم کی قومیں آباد ہیں جن کے الفاظ سنسکرت سے ملتے جلتے ہیں اور انکی عبادت گاہوں میں ہندو مندروں کے سنگاسن وغیرہ سے ملتی ہوئی چیزیں اب بھی موجود ہیں اور پھر پرانے زمانہ کی امریکن دیشی زبان اور سنسکرت اور پراکرت کے الفاظ بہت ملتے جلتے ہیں۔ میں اس بارہ میں ایک تھیسس لکھ کر خود برلن یونیورسٹی میں پیش کرنیوالا ہوں۔"

تیسرا رُخ

تُخم تاثیر صحبت کا اثر ان پروفیسر آچاریہ کے ساتھ ایک لدھیانہ کے رہنے والے سفید پوش مسلمان منشی ملازم بھی تھے پڑھے لکھے بھی تھے اور طاقتور بھی تھے۔ وضعدار و وفادار و نیک خو لیسے تھے کہ پروفیسر صاحب

کے ساتھ ایسے ہوئے کہ پروفیسر اور ان کا یہ مضمون ہو گیا کہ تجھ کو اور نہیں اور مجھ کو ٹھور نہیں۔ کار آمد ملازم کو کوئی نہیں نکالتا تو مہربان آقا سے کوئی کیوں روگشی کرے۔ قصہ مختصر صحبت کا اثر یہ حضرت بھی اسی قسم کی تحقیقات کی طرف مائل ہو گئے۔ پروفیسر صاحب کے منہ چڑھے نوکروں میں سے اور پھر انگریزی بھی پڑھ چکے تھے تحقیقات کی کنجی تو ان کے ہاتھ آہی گئی تھی اور یہ خوب جانتے تھے کہ جہاں الفاظ کے تلفظ میں دراصل وہیں پھر تحقیقات کی ابتدا اور انتہا بھی ہے۔ چنانچہ غور کرنا شروع کیا کیونکہ ان کو کچھ بُھگی سی معلوم ہو رہی تھی کہ پُرانے زمانہ کے ہندو تو ایسے سورما نکلے کہ جہان چھان مارا اور جگہ جگہ نوآبادیات قائم کیں اور ہم مُسلمان کچھ نہیں۔ سُنتے آئے تھے کہ مُسلمانوں نے بھی ساری دُنیا چھان ماری ہے اگر کوئی غور کرے تو عجب نہیں انکشافات کا ڈھیر لگ جائے۔ مینڈک کی دُنیا کنواں اور ان خاں صاحب کے مُسلمانوں کا منبع اور خزانہ لدھیانہ۔ انہوں نے جورات کو چائے پی کر حقہ پیتے میں اپنے دماغ پر زور ڈالا تو کام چل گیا۔ جزائر برموڈس اگر لاہور کے پنڈت برہم داس نے بسائے ہونگے تو شیخ چلّی نے جن کے نام سے لدھیانہ کا ہر فرد بشر آگاہ ہے۔ ضرور اپنا جہاز آگے بڑھا کر امریکہ کے اُس صوبہ کو بسایا ہو گا جو آجتک اُن کے نام سے "چلّی" مشہور ہے اور امریکہ کی مشہور جمہوری سلطنت ہے ٹھیک

بالکل ٹھیک۔ آگے چلئے۔ پیر بخش ایسا نام ہے کہ اس نام کے اگر آدمی تلاش کئے جائیں تو صرف لدھیانہ ہی میں دس بیس نہیں بلکہ سو ڈیڑھ سو نکل آئیں۔ یہ نام ظاہر ہے نیا نہیں لٰہذا پتہ چلتا ہے کہ مہاراج برہم داس کے ساتھ ساتھ علاوہ شیخ چلّی کے پیر بخش پنجابی عرف پیرو بھی تھے جو پنڈت جی مہاراج کو جزائر چھوڑتے ہوئے شیخ چلّی کے ساتھ ساتھ گئے۔ شیخ صاحب کو وہیں چھوڑ کر خود یہ آگے بڑھ گئے اور چل کر شمالی ساحل پر اُترے اور وہاں اپنے نام پر اُس حصہ ملک کو "پیرو" مشہور کیا چنانچہ آجتک مملکت "پیرو" اُسی نام سے مشہور چلی آتی ہے۔

اِتنے میں پروفیسر چہل قدمی کرتے آنکلے اور ان سے پوچھا کہ کیا کر رہے ہو۔ انہوں نے فوراً اپنی تحقیقات پیش کر کے دادِ تصدیق چاہی۔ پروفیسر صاحب نے اِس جہالت پر برافروختہ ہو کر کہا "یہ جہالت کی باتیں مت کرو"۔ خانصاحب کا رشتہ پروفیسر صاحب سے ایسا نہ تھا کہ کچھ زیادہ حجت کرتے لٰہذا مجبور ہو گئے۔

نتیجہ

اس وقت تو خانصاحب خاموش ہو گئے تھے مگر حُسنِ اِتفاق کہ لاہور کے مشہور پرچہ "ہمایوں" کے جون کے پرچہ میں ایک مضمون اُن کی

نظر سے گذرا۔ "کولمبس سے پہلے امریکہ میں عربیت" یہی کیا کم تھا آگرہ کا مشہور رسالہ پیمانہ بابت ماہ مئی ۱۹۳۰ء بھی یہ کہیں سے پا گئے جس میں پہلے مضمون کی سُرخی "کیا سری کرشن جی اسرائیلی تھے" انکے لئے جاذب نگاہ تھی مضمون شروع سے آخر تک پڑھا اور پھر "ہمایوں" کا کولمبس والا مضمون پڑھا کئی بار دونوں کو پڑھا۔ پڑھ کر ایک رائے قائم کی "خواہ نوکری رہے یا جائے آج پروفیسر صاحب سے کھُل کر باتیں کرونگا" یہ سوچ کر پروفیسر صاحب کے پاس پہنچے۔ پروفیسر صاحب اپنی لائبریری میں بیٹھے کیا تھے بلکہ ارد گرد کتابوں رسالوں اور مسودوں کے انبار میں پوشیدہ تھے خانصاحب نے دونوں مضمون دکھائے۔ پروفیسر صاحب نے غور سے پڑھے اور پھر پڑھے۔ بجائے بحث کرنے کے وہ خاموش سے ہو گئے۔ اُٹھ کر ٹہلنے لگے۔ دیر تک سر کھجایا کئے۔ پھر میز پر آئے "یہ سب حماقت ہے" کہہ کر اپنا وہ تحقیقاتی تھیسس جو وہ خود برلن یونیورسٹی لیکر جا رہے تھے پھاڑ کر ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا خانصاحب کی طرف دیکھ کر کہا "یہ رسالے تمہارے ہیں"؟ انہوں نے کہا "جی نہیں" پروفیسر بولے "اگر تمہارے ہوں تو ان میں سے وہ دونوں مضمون بھی پھاڑ ڈالو" خانصاحب نے کہا "کیوں"؟ پروفیسر صاحب بولے "یہ مرض ٹھیک نہیں ہے" واللہ اعلم۔

حقیقتِ نغمہ!"

آہ بیل! تیری مرمریں پیشانی کس قدر باصرہ نواز ہے! اُف! ......
تیرے بائیں کان کے گوشہ میں ایک کشمشی چھچھڑے لپٹی ہوئی سیج مُچ گوشِ حقیقت نیوش" ہوئی چلی جارہی ہے۔ اور عجب نہیں کہ وہ پھوٹ پھاٹ جائے اور پھر فضائے خوشگوار میں نشہ آور ارغوانیت کا سیلابِ شفقی پھیل جائے!
ہاں! ہاں! پیارے بیل —— اُف! تیری چشمِ مخمور میں انہار چیپڑ جاری ہیں اور پاکیزگی کی پریاں یعنی مکھیاں پروانہ وار اُن کے سواحل باصرہ مآب پر رقص کر رہی ہیں!

آہ بیل! —— سکوت —— سکوت کامل ہے —— سوائے مکھیوں کی لاتوں کے! .... یا پھر مرمریں لاٹھی یعنی تیری دُم خود فضائے نورانی میں تخیلی ابرو کھینچ کر مکھیوں کی لاتوں کی ہمنوائی کرکے فضا کو نغمات کے خواب آور زمزمہ سے آشنا کر رہی ہے؟ .... یا نغمات کی کمی محسوس کرا رہی ہے مگر نہیں —— آہ بیل —— نغمہ کی حقیقت کی

لہ باصرہ نواز کیڑا جس کو کلّی بھی کہتے ہیں۔ خون آشام ہے۔

تمہید ـــــ یہ کیا؟ اُف! ...... یہ پیاری لیچڑ[1] کا تکلم گلریز زمزمہ آفرین ہے! جو گوش تشنہ کے غشاء طبلی سے مس آشنا ہو کر حِس سمع کو مسرور بنا رہا ہے!

اے میرے پیارے لیچڑ ـــــ ہاں ـــ ہاں ـــ تم حِس سمع کو مسرور تعمیر کرو۔ اور آہ ـــــ پیارے بیل تم اس پیارے لیچڑ سے میری طرف سے تبسّم آفرین التجا کردو کہ وہ فضائے لطیف کا تموّج دار تجاج قدرے تفکر نازک کے ساتھ جذب سماعت ہونے دے ـــــ مگر ـــــ!!

حبّذا ـــ ہرّا! خوش آمدید کیچڑ سے نکل کر باہر آنے والی خاتون۔ یعنی آہو چشم مست مناظر دوشیزہ ـــــ آہ بھینس! ـــــ تمہارے روح پرور نغمے میری سماعت کی وسعتوں میں جنتیں نہیں بنا دیں گے؟ ـــ اُف۔ تم مجسّم نغمہ ہو ـــ موٹا سا آبنوسی نغمہ ہو .. .... ہاں ہاں ......

اے بھینس تو خود نغمہ ہے اور تیرے نازک لبوں پر مسکراہٹ کا نغمہ رقص کر رہا ہے!

آہ بھینس! ـــ اے غنچہ دہن! ـــ تیرے خوبصورت اور نازک لبوں کا ارتعاش یہ کہہ رہا ہے کہ تیرے منہ کے اندر نغمہ اس طرح مقید ہے جس طرح غنچہ میں بوئے منتشر!

---

[1] اس فصیح لفظ کو اودھ کے دیہاتی بھینس کے اُس نورِ چشم کیلئے بولتے ہیں جو شباب آفرینی سے بہت ہی دور ہو۔

اُف! تو خود تفسیرِ نغمہ ہے ـــــ تیرے عذارِ بوسہ طلب کی قسم ـــــ تیرے نظارۂ ایمان سوز ہی سے پتہ چل جاتا ہے کہ نغمہ ہوائے محیط بالا بدان کے ارتجاج کا نام ہے۔ لہٰذا اے حسینہ تو اس ارتجاج کو تصادم و اصطکاک اجزائے لینہ یا صلبیہ سے پیدا کر۔ تاکہ ہوا میں ایک خاص تحرک پیدا ہو۔

آہ بھینس! ـــــ رحم ـــــ رحم ـــــ تیری اصوات نغمہ کیف آفریں ہُوا کرتی ہیں! دل لرز جاتا ہے ـــــ بلکہ اکثر رُوح کانپ اُٹھتی ہے اور ہوا میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے! بھولی بھینس! ـــــ میری رُوح کو تیرے نغمہ سے حظ حاصل ہوتا ہے۔ نغمہ میری رُوح کی غذا ہے اور اس سے میری طبع ناساز کو بشاشت حاصل ہوتی ہے۔

آہ بھینس! خمدار سینگوں والی دوشیزہ تو بیل کی چچازاد بہن ہے اور میں مغموم ہوں۔ ہاں ہاں۔ میں مغموم ہوں ـــــ اور مناظر رنگین آہنگ طراز ہیں ـــــ میری رُوح چاہتی ہے کہ عالم روحانیت میں تیرے نغمات طرب افروز سے مخمور ہو جائے۔ لہٰذا اگر اجازت ہو اور بارِ خاطر طبع نازک نہ ہو تو ایک لٹھ لے آؤں اور دوں تیری مینائی گردن پر۔

بھینس مُسکرائی اور مجھ سے کہا۔

"تیرا آوازہ گوشں میرے دل کی طرح بیقرار ہے۔ لہٰذا میں تو اُن گملوں کے پھُول قطعی کھاتی ہوں!"

دفعتہً لپک کر میں نے اپنی ہاکی اسٹک اُٹھائی.........

اور آہ! بھینس کی مینائی گردن پر اُس کا پڑنا تھا کہ نغمہ کی حقیقت اور Poetry of motion (رقص الحرکات) کا فلسفہ آئینہ ہو گیا۔

لاؤ افسانہ

:: ۱ ::

میری طرف انہوں نے بڑے غور سے دیکھا۔ ایک ہاتھ میں ان کے رسالہ کا پہلا نمبر تھا۔ اور چند کاغذ۔ میں نے انہیں خود مشکوک نظروں سے دیکھا۔

انہوں نے کہا "آپ کون ہیں"؟

میں نے جواب دیا "آپ کون ہیں"؟

انہوں نے پھر پوچھا "مگر آپ کون ہیں"؟

میں نے کہا "میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

انہوں نے کہا "میں ایڈیٹر ہوں۔ یہ ہے میرا رسالہ"

بس میرے جیسے گولی لگی۔ چہرہ فق ہوگیا۔ آگیا ملک الموت! انہوں نے اپنا رسالہ پیش کیا۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ یہ توپ دکھا رہے ہیں۔ مسلّح ہیں۔ یا میرے اللہ اب میں کیا کروں۔

:: ۲ ::

میں نے بہتری اسی میں سمجھی۔ کہ رسالہ ان کے ہاتھ سے لیکر کوئی تدبیر سوچوں۔ رسالہ کو بیچ میں سے میں نے کھول کر دیکھا جیسے پڑھ رہا ہوں۔

اِدھر دیکھا۔ اُدھر دیکھا۔ اُلٹا۔ پلٹا۔ ایک اعلان نظر پڑا۔ بڑے بڑے حرفوں میں: "آئندہ نمبر بڑی شان سے نکلے گا!" حسب ذیل اہل قلم نے مضمون دینے کا پختہ وعدہ فرمایا ہے۔ معاً مجھے خیال گذرا۔ کہ ان پھانسی پانے والوں میں میرا نام تو نہیں ہے۔ چشم زدن میں اپنے نام پر نظر پڑی! دل بیٹھ گیا! یا میرے اللہ! میں نے کیا خطا کی تھی۔! اب کیا کروں؟"

میں نے کنکھیوں سے اپنے جلاد کی طرف دیکھا طرح طرح کے خیالات میرے دل میں آئے بائیں طرف میں نے نظر دوڑائی۔ سامنے کنواں تھا۔ کچھ فاصلہ پر۔ سوال یہ تھا۔ کہ کیوں نہ ایکدم سے رسالہ پھینک کر بھاگوں سر پہ پیر رکھ کر۔ اور پھاند پڑیں کنویں میں! بیشک یہی ٹھیک ہے۔ لیکن معاً خیال آیا۔ کہ بیکار ۔ اگر فوراً گرتے ہی نہ مر گئے۔ تو یہ ظالم رسیاں ڈلوا کر نکلوا لیگا اور پھر بغیر افسانہ لکھوائے نہ چھوڑے گا۔ پھر کیا کروں؟ کیوں نہ ذرا آگے بڑھ کر نہر میں پھاند پڑوں۔ لہٰذا میں نے پوچھا۔

"آپ تیرنا جانتے ہیں؟"

وہ بولے: "جی ہاں جانتا ہوں ایک سانس میں بیس گز کا غوطہ لگاتا ہوں"

اوہو۔ میں نے دل میں کہا۔ کہ یہ بھلا کاہیکو چھوڑے گا۔ نکال لے گا تیر کر اور ہرگز ڈوبنے نہ دیگا۔ اور پھر اس کے بعد اُلٹا لٹکا کر پیٹ میں کا سب پانی نکلوا کر بعد میں افسانہ لکھوائیگا۔ میں ان کو غور سے دیکھنے لگا۔

:: ۳ ::

"مگر اس سے آپ کا مطلب" انہوں نے کریدتے ہوئے پوچھا۔
میں نے دل میں سوچا۔ کہ کیوں نہ آج جان پر کھیل جاؤں۔ دل کو مضبوط کیا۔ ہمت باندھی۔ کہ پھر وہ بولے۔

"معاف کیجئے گا۔ آپ کا رویہ کچھ .... آپ ...."

"جناب" میں نے کہا "تو پھر میں بھی ...... میں بھی ... میں ......"

"کیا مطلب" انہوں نے تعجب سے میری طرف دیکھ کر کہا۔

میں نے دل مضبوط کر کے کہا "جناب میں بھی کسی سے ..... خواہ مخواہ ...."

"معاف کیجئے گا۔ میں جناب کے رویہ اور گفتگو سے حیرت میں ہوں میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ...."

بات کاٹ کر میں نے کہا "تو پھر جناب میں بھی کسی سے نہیں ڈرتا"

"آپ کون ہیں" ؟

میں کھڑا تو تھا ہی۔ پاس رکھا تھا ایک مونڈھا۔ لپک کر میں نے مونڈھا اٹھایا۔ بجلی کی طرح لپک کر اپنا نام بتاتے ہوئے میں نے کہا کہ "میں افسانہ نویس ہوں" اور یہ کہتے ہوئے میں نے مونڈھے کے نیچے ایڈیٹر صاحب کو بند کرنے کی کوشش کی اور بھاگا۔

ایک نعرہ کے ساتھ انہوں نے مونڈھا اُدھر پھینکا۔ "افسانہ لاؤ" یہ کہہ کر وہ لپکے۔ تین سیڑھیاں پھاند کر وہ دوڑے کہ "لینا اسے"! . . . . . اب میں آگے اور وہ پیچھے۔

:: ۴ ::

لینا اسے . . . . پکڑنا . . . . . . جانے نہ پائے . . . . لاؤ افسانہ . . . . "

یہ ہیبت ناک صدائیں میرے کانوں میں آرہی تھیں۔ اور میں زور سے گویا ہوا کے پر لگائے اُڑا جا رہا تھا۔ کس قدر زور سے میں دوڑ رہا تھا کہ بیان سے باہر۔ رفتار کی تیزی اور طبیعت کے غیر معمولی ہیجان کی وجہ سے سارے جسم کا خون سمٹ کر معلوم ہوتا تھا۔ کہ جیسے چہرہ اور دماغ میں پہنچا ہے۔ پیر ہلکے اور سر بھاری ہو رہا تھا۔ اور اڈیٹر کی خوں آشام آواز کہ "اسے لینا۔ پکڑنا۔ اور لاؤ افسانہ" میرے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح پڑ رہی تھی۔ یہ سب کچھ۔ مگر میں اُڑا جا رہا تھا۔ اور میرے پیچھے ایڈیٹر۔

:: ۵ ::

کنواں پیچھے رہ گیا تھا۔ نہر الگ چھوٹ گئی تھی۔ میری رفتار میں وہی تیزی تھی۔ اور ایڈیٹر صاحب کے استقلال میں بھی فرق نہ پڑتا معلوم ہوتا تھا۔ میں اتنا دوڑا اور دوڑ رہا تھا۔ مگر میرے تعاقب کرنے والے کے بھی گویا

پر لگے تھے۔ اگر میں کہیں مونڈھے سے کام نہ لیتا تو کیا ہوتا۔؟ یہ ہوتا کہ دو لمحہ کا جو دفعہ مجھے بھاگنے کو مل گیا۔ وہ ہرگز نہ ملتا۔ اور پھر کیا ہوتا؟ میری روح کانپ گئی۔ کیونکہ یہ ہوتا کہ میں کب کا پکڑا جا چکا ہوتا۔ اور اس وقت جبکہ میں جان بچا کر بھاگ رہا ہوں۔ مجھ سے افسانہ لکھوایا جا رہا ہوتا۔ میں یہ خیال کر کے اور بھی تیزی سے بھاگا۔ مگر ایڈیٹر نے بھی اسی مناسبت سے زور لگایا۔ میں نے مڑ کر دیکھا کہ ایڈیٹر نہیں۔ بلکہ ایک متحرک و متزلزل بلا ہے کہ بھنّاتی ہوئی چلی آرہی ہے۔ میری طرف .... "لاؤ افسانہ" ان کے منہ سے نکلا اور رفتار انہوں نے اور تیز کر دی۔

—— : ۶ : ——

میں نے بھی زور مارا میں نے بھی قدم بڑھائے مگر بہت جلد مجھے معلوم ہو گیا کہ میں تھک رہا ہوں نہیں بلکہ تھک گیا ہوں۔ اور ایڈیٹر؟ میں نے مڑ کر دیکھا وہاں تھکن کا بھلا کا م؟ ایک گولی تھی کہ آرہی تھی بھنّاتی ہوئی میرے پیروں میں تھکن معلوم ہوئی۔ چشم زدن میں ایسا معلوم ہُوا۔ کہ جیسے بالکل تھک گیا۔ اور اب گرا اور اب گرا میں نے مُڑ کر دیکھا۔ اور ایڈیٹر صاحب نے نعرہ مارا کہ "لاؤ افسانہ" اِن کی گرج سے میرا دل ہل گیا۔ تھکن سے کمزوری سی محسوس ہوئی۔ میرے اور ایڈیٹر صاحب کے درمیان مونڈھے والی ترکیب سے جو فاصلہ تھا۔ وہ پہلی دفعہ گم ہوا۔ میں نے پھر زور مارا مگر بیکار۔ تھوڑی

ہی دیر میں فاصلہ اور کم ہوگیا۔ اور پھر تھوڑی دور ہی جاکر اور بھی کم ہوگیا۔ اب میں اپنے خون کا آخری قطرہ۔ اپنی جان کا آخری سانس۔ اپنے زور کا آخری شمہ۔ اپنی ہمّت کی آخری رمق اپنی جان بچانے میں استعمال کر رہا تھا۔ مگر ایڈیٹر صاحب اب گویا سر پر تھے۔ اور مجھے مایوسی ہوگئی تھی۔ میں قطعاً مایوس ہوچکا تھا۔ بالکل مایوس تھا۔

———— ۷ ————

مگر جو کسی نے کہا ہے۔ کہ خدا مسبب الاسباب ہے۔ وہ کارساز حقیقی ہے۔ جب انسانی قوتیں جواب دیدیتی ہیں۔ جب تمام دنیاوی تدبیریں فیل ہوجاتی ہیں۔ جب کوئی امید نہیں رہتی تو آدمی خدا کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ میری حالت نازک ہے۔ چنانچہ گڑگڑا کر میں نے دعا مانگی۔ "اے رب المشرقین و مغربین۔ تو نے حضرت یونس ؑ کو شکم ماہی میں پناہ دی۔ اے رب کعبہ تو نے حضرت ابراہیم کے لئے ارشاد فرمایا "یا نار کونی برداً وسلاماً علیٰ ابراھیم" اور اس نارِ عظیم کو ٹھنڈا کر دیا اے میرے معبود تو نے حضرت موسیٰ کو فرعون سے بچایا۔ اور اے میرے رحیم تو نے اپنے پیارے حبیب ؐ کو کفّار کے فتنوں سے محفوظ رکھا۔ کیا تیرا یہ خاکسار بندہ۔ تیرے حبیب کی امت کا ایک فرد اس لائق بھی نہیں کہ اسے تو ایک ایڈیٹر سے بچالے۔ کہ چلا آرہا ہے بلائے آسمانی کی طرح میرے سر پر کہہ لاؤ افسانہ"

کسی نے کہا ہے کہ۔ ع

"بات جو مُنہ سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے"

دُعا چونکہ مصیبت کے وقت میں ———— نکلی تھی۔ لہٰذا دل سے نکلی تھی۔ اور فوراً مقبول ہوئی۔ جی ہاں فوراً مقبول ہوئی اور کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے ریل کی پٹڑی ہے اور چلا آر ہا ہے۔ ایک انجن دور سے دندناتا۔ پھنکارتا بل کھاتا ہُوا۔ ع۔ عید گاہ ما غریباں روئے تو۔ کہہ کریں جھپٹا۔ اب انجن کی طرف۔

———— ۸ ————

مگر اب تو ایڈیٹر صاحب سر پر تھے۔ اور میں آخری زور مار رہا تھا اور اِدھر ایڈیٹر؟ وہ قریب پہنچ گئے۔ بلکہ بالکل قریب میں نے مُڑ کر دیکھا۔ وہ ہاتھ بڑھائے میری قمیص پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بلکہ ان کی اُنگلیاں دو ایک مرتبہ شاید میری قمیص سے چھو بھی گئی تھیں۔

مگر اب وہ قریب تھے تو کیا ہُوا؟ انجن بھی قریب تھا۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے مجھے پکڑا۔ اب پکڑا۔ مگر میں نے جو زور مارا ہے تو انجن کے پاس اور اِدھر انہوں نے میری قمیص میں ہاتھ لگایا ہے کہ بسم اللہ کہہ کر میں نے اپنے کو انجن کے سامنے ڈال دیا۔ اور انجن میرے اوپر سے پھر گیا۔ عرض یہ ہے۔ کہ انجن اوپر سے گذرے تو بہت درد ہوتا ہے اور بالخصوص

جبکہ اس کا اگلا پہیہ گلے پر سے پھر رہا ہو۔ لہٰذا مارے تکلیف کے زور سے میں چیخ کر اچھلا۔۔۔۔۔۔۔۔ "یہ کیا ہے؟" جھٹک کر کسی نے کہا۔ اور میں نے بوکھلا کر جواب دیا: "میں افسانہ نویس ہوں"

"ہوش میں آؤ" چیخ کر خانم نے کہا۔ "یہ افسانے اور رسالے نہ ہوئے کہ پاگل ہو گئے تم! سوتے میں کوئی ایسی ڈراؤنی آوازیں بھی نکالتا ہے افسانے گئے چولھے میں"

جلدی جلدی آنکھیں مل کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ خدا کا شکر ہے کہ کوئی ایڈیٹر و یڈیٹر نہیں تھا۔ مگر ہاں میرے کرمفرما محترمی محمد احمد خانصاحب درانی ایڈیٹر "جہانگیر" کا ساتواں تقاضا کہ "لاؤ افسانہ" ایک خط کی صورت میں البتہ رکھا ہوا تھا۔ اب سوال یہ وہ کونسا رسالہ تھا۔ جس کے ایڈیٹر نے مجھے اس بُری طرح سے دَوڑایا۔ اور رپٹا کر خواب ہی میں پست کر دیا تو بہتر ہے۔ کہ اس سوال کو محتاج جواب ہی رہنے دیجئے۔ کیونکہ سچ سچ میں بتاؤں گا نہیں۔ اور جھوٹ سے کوئی نتیجہ نہیں۔ آپ کو تو محض یہ دیکھنا ہے کہ خاص نمبر کے سلسلہ میں ایڈیٹر اور افسانہ نویس میں کیسی چھنتی ہے۔

"بکرا کیوں جاتا ہے؟"

پہلا رُخ

۱

عید کا دن تھا۔ چاروں طرف رونق اور چہل پہل۔ نماز سے فارغ ہو کر اب پہلوان دھومی کا انتظار تھا کہ عین انتظار میں پہلوان صاحب آپہنچے اس کان سے اس کان تک پان کھائے ہوئے۔ سُرخ رنگ کا بنارسی سیلا۔ مخمل کی واسکٹ اور گلے میں رومال۔ سینہ کیا تھا گویا چکی کا پاٹ، بائیں کلائی پر ایک نازک سی گھڑی۔ آتے ہی بعد سلام علیک انہوں نے ایک میلا سا جھاڑن نکال کر تپائی پر رکھ دیا جس میں کچھ لپٹا ہوا تھا۔ پھرتی سے کلائی سے گھڑی کھول کر رکھی اور صافہ رکھ کر سیدھے تیزی سے آستین چڑھا کر بکروں کی طرف چلے۔ دو بکرے تھے ایک کا نام ڈُگرو ایک کا نام موتی۔ موتی کو وہ اپنے ساتھ لئے آئے۔

۲

تپائی پر جو جھاڑن رکھا تھا اس میں دو چھُریاں تھیں۔ ایک بڑی اور

ایک چھوٹی بڑی چھری لے کر سامنے نیم کے نیچے پہلوان گڑھا سا کھودنے لگے اور چھوٹی چھری کو دیکھنے کی نیت سے میں نے ہاتھ میں لیا۔ موتی نے میرے ہاتھ کی چھری کو سونگھا اور حسب عادت میرے ہاتھ کو بھی چاٹنے لگا اُس ہاتھ کو جس سے اسکی زندگی کا ابھی خاتمہ ہونے والا تھا۔

میں نے اس چھری کو دیکھا نازک بدن کامنی سی ریت کے فولاد کی چھری تھی۔ اس کی دھار کو میں نے انگوٹھے سے ٹٹولا۔ اُسترے کی سی چکنائی کی بجائے دھار پر ایک خونخوار مگر نہایت ہی تیز اور کھُردری باڑھ تھی۔

——— :: ۳ :: ———

گڑھا تیار ہو گیا تو پہلوان نے موتی کو لیجا کر بے خبری میں دے پٹکا اپنے شہ زور بازوؤں سے گردن اور گلا دبا دیا اور طاقتور گھٹنے سے موتی کو ایسا قابو میں کیا کہ بالکل بے بس کر دیا میں نے بڑھ کر بسم اللہ کہہ کر اسی چھری سے موتی کو ذبح کر دیا اور مڑا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ دوسرا بکرا ڈگرو جنگلہ کے کونہ پر سے جھانک رہا ہے۔ اور دیکھ رہا ہے کہ موتی کا کیا حال ہوا کہ مُرغ بسمل کی طرح تڑپ رہے ہیں۔ مجھے یہ بات بہت ناگوار گزری اور میں نے دھومی سے کہا:۔

"دیکھو ڈگرو جھانک رہا ہے یہ تم نے کیسے باندھا تھا"

دھومی نے ڈگرو کی طرف نظر کی اور کہا "بڑا بدمعاش ہے"!

۴

میں ڈگرو کے پاس پہنچا اور میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا میں نے دیکھا کہ اس کے نتھنوں میں جنبش ہے۔ گویا موتی کے خون میں سے وہ موت کی بو سونگھ رہا ہے۔ وہ سہما ہوا تھا میں نے چمکار کر اسکے سر پر ہاتھ رکھا جسکو وہ سونگھنے لگا ایک دبی ہوئی آواز نکالی میں نے اس کا سینگ پکڑ کر اس کو موڑ لیا تاکہ موتی کی خونیں لاش وہ نہ دیکھ سکے میں نے پھر اسکی پیٹھ پر ہاتھ رکھا، شاید بدن میں لرزش تھی، کیا یہ ممکن نہیں کہ ڈگرو جان گیا ہو کہ میرا آخری وقت اب قریب آگیا ہے۔ اتنے میں دھومی بھی لپکے ہوئے پہنچے وہ بھی اس طرح کہ موتی کے خون میں ہاتھ لال۔ میں نے کہا: "بھئی! تم بڑے ظالم ہو۔ بھلے مانس! ہاتھوں کا خون تو پونچھ لیا ہوتا"

اپنے خونی ہاتھوں سے ڈگرو کا کان پکڑتے ہوئے دھومی نے کہا۔ "اب جناب اتنا وخت کہاں سے آیا کہ ان بدمعاشوں کے لئے ہم ہاتھ دھوتے پھریں اور انکے نخرے اٹھائیں" یہ کہہ کر جو پہلوان نے ڈگرو کا کان پکڑ کر مقتل میں لیجانا چاہا تو ڈگرو اڑ گیا مگر کہاں ڈگرو، بکرا اور کہاں پہلوان دھومی۔ "ابے مرا کیوں جاتا ہے" منہ بگاڑ کر دھومی پہلوان نے کہا: "چلتا بھی ہے کہ نہیں مفت خدا کے لئے دیر م دیر کر رہا ہے"!

یہ کہہ کر ریلم ریل اور گھسیٹم گھسیٹ موتی کی لاش پر کھڑا کیا۔

۵

چھری میرے ہاتھ میں تھی اور میں نے اس کی خونی دھار کو سورج کی روشنی میں دیکھا۔ چھری سے موتی کا خون تو پونچھ دیا تھا مگر سورج کی کرنوں میں خونخوار اور کھردری دھار کی درانتی کے ذرے موتی کے خون سے رنگین ہو کر مجھے ناچتے ہوئے نظر آئے۔ کس صفائی سے موتی کے گلے کو کاٹتی ہوئی چلی گئی تھی۔

اب ڈگرو کی باری آئی مگر ڈگرو نے واویلا شروع کر دی تھی۔ اسکی آواز بھیانک تھی، اور اس میں وحشت تھی۔ پہلوان نے اس گڑھے کی طرف ڈگرو کو گھسیٹا جس میں موتی کا خون ایک چمکدار سرخ شیشہ کی طرح پڑا جھلک رہا تھا۔ ڈگرو نے اس خونی گڑھے کو دیکھا اور پھر موتی کی بے جان لاش کی طرف۔ پہلوان دھومی نے ڈگرو کو اڑنگے پر لادا مگر چونکہ ڈگرو موتی سے کہیں زیادہ طاقت ور تھا لہٰذا زور لگا کر ڈگرو اڑنگے سے نکل گیا اور ایک نہایت ہی خوف زدہ آواز نکالی "ابے مرا کیوں جاتا ہے" جھنجھلا کر دھومی نے کہا اور چشم زدن میں ڈگرو کو دے مارا۔ بائیں ہاتھ سے سر کو ڈگرو کے رگڑ ڈالا، اور گھٹنے پر اپنے سینہ کا زور دے کر "ابے مرا کیوں جاتا ہے" کہہ کر ڈگرو کو قابو میں کر لیا اور میں چھری چمکا کر بسم اللہ کہہ کر آگے بڑھا۔

۶

ڈگرو کی نوجوان اور قوی گردن تنی ہوئی تھی اور ناک اور منہ سے جو

پہلوان کے سشہ زور ہاتھ کی مُٹھی میں تھا۔ دبی اور گھٹی ہوئی آواز نکل رہی تھی، کہ اتنے میں میں نے خوبصورت چھُری کو جگہ پر پہنچایا۔ ہاتھ کی کھینچ کے ساتھ چھُری کی باڑھ کے خونخوار دانے ڈگرو کی گردن کے سخت بالوں میں اٹکے کہ دفعتہً جیسے پو پھٹ گئی! یعنی پوست کٹ کر "سپیدہ" نمودار ہوا...... کھال کے نیچے کی گلابی سطح نظر بھی نہ آنے پائی تھی کہ وہ کامنی چھُری گوشت اور پوست اور ڈگرو کے نوجوان گلے کی رگوں میں ایک "خراٹے" کے ساتھ تیزی سے لہراتی اور تیرتی چلی گئی! اور گردن کی ہڈی پر جاکر بولی! خون کا فوارہ ایک "شراٹے" کے ساتھ پہاڑی دریائی طرح ڈگرو کے بریدہ حلقوم اور پھڑکتی ہوئی رگوں اور گوشت پر سے اُچھلتا ہوا نکلا، اور ساتھ ہی ڈگرو نے ایک پُر زور تڑپ لگائی جس سے جانکنی کی انتہائی تکالیف کا اندازہ ممکن تھا۔ ڈھقومی نے میرے ہاتھ سے چھُری لیکر گردن میں کسی خاص مقام پر چھُری کی نوک زور سے بھونک دی جس کی وجہ سے ڈگرو کا تن بدن تڑپ گیا مگر "ابے بدمعاش" کہہ کر پہلوان نے ڈگرو کی گردن توڑ دی اور گردن کے شگاف کو چیر کر کان سے ملا دیا۔

دُوسرا رُخ

۱

ایک روز کا ذکر ہے کہ میں دفتر میں بیٹھا ہوا کچھ کاغذات دیکھ رہا تھا

کیا دیکھتا ہوں کہ دھومی پہلوان چلے آرہے ہیں چہرے سے رنجیدہ اور کچھ ہوش باختہ سے معلوم ہوئے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ معاملہ کچھ زیادہ اہم نہیں ہے یعنی صرف اتنا ہے کہ پہلوان صاحب نے ایک آدمی کے ہاتھ کی ہڈی لکڑی سے مار کر توڑ دی! اس نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا چنانچہ اب مقدمہ چل رہا تھا۔ اور وہ مقدمہ اب اس نوبت پر تھا کہ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ موجود تھا کہ ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ خود دھومی خاں کا اقبال موجود تھا کہ ہاں ہم نے ہی توڑی ہے اور علاوہ بریں چار پانچ گواہ جن کا بیان تھا کہ ہمارے سامنے توڑی۔

میں نے غور سے تفصیل سنی اور صاف صاف کہدیا کہ مقدمہ تمہارا خراب ہے اور بہتر ہے کہ مجھے وکیل مت کرو۔ میں نے دیکھا کہ یہ سُن کر دھومی کے سے طاقتور پہلوان کا چہرہ فق ہو گیا کچھ سہم سے گئے۔ گلے میں آواز ان کے رکتی سی معلوم ہوئی۔ جب انہوں نے ارادہ ظاہر کیا کہ خواہ کچھ ہو جائے مجھے تو ان کو اب بچانا ہی پڑیگا۔ یعنی یہ کہ ان کے مقدمہ کی پیروی کرنا ہی پڑے گی۔

—— ۲ ——

واضح رہے کہ مقدمہ کی کامیابی اور ناکامیابی کی فضول پریشانیوں سے ایک وکیل بددل کبھی نہیں ہوتا خواہ مؤکل چھوٹ جائے اور خواہ اسے

لگ جائے پھانسی وکیل کو توڑنے سے مطلب ۔ چنانچہ صاف اور یقینی نتیجہ کی طرف سے بے خبر اور خالی الذہن ہو کر میں نے اس زور سے مقدمہ کی پیروی شروع کی کہ ایک دفعہ کو میں بھی بھول گیا کہ واقعی نتیجہ خراب ہوگا ۔ الٹی سیدھی بحث ۔ بات بات پر وکیل سرکار کی قانونی گرفت کرنا ۔ ایک ایک لفظ پر بات کا بتنگڑ بنا دینا اور گواہان استغاثہ کو پکڑ پکڑ کر دوران جرح بڑی طرح جھنجھوڑنا یہ تمام باتیں ایسی تھیں کہ دھومی پہلوان پیشی کے روز سینہ اُبھارے اور گلّہ پر کلّہ چڑھائے مُسکراتے ہوئے آتے تھے ۔ کہ کا دل سے ڈر نکل چکا تھا ۔

—————— :: ۳ :: ——————

آخر کو وہ دن بھی پہنچا کہ مقدمہ کی آخری بحث ہوئی اور فیصلہ کی تاریخ مقرر ہوئی اسی روز کا ذکر ہے کہ رات کو دھومی پہلوان میرے پاس آئے اور کچھ پریشان سے ہو کر انہوں نے کہا ۔ "وکیل صاحب ! یہ کیا معاملہ ہے" میں نے کہا "کیا بات ہے" ؟ تو وہ بولے کہ "سب لوگ یہی کہہ رہے ہیں کہ مجھے قید ہو جائیگی" ۔ میں نے غور سے دھومی کی طرف دیکھا آپ خود غور فرمائیں ۔ کہ میں کیونکر ان کے مُنہ پر کہہ دیتا کہ ہاں لوگ سچ کہتے ہیں اور تمکو ضرور قید ہو جائیگی لہٰذا میں نے انکو وکیلوں کا سا جواب دیا کہ "کوشش جو کچھ ہو سکتی تھی اس میں تو کسر اُٹھا نہیں رکھی اب آگے خدا جانے" ۔

دھومی بھائی کا اس جواب سے اطمینان نہیں ہوا اور اُنہوں نے یہ چاہا

کہ میں دل کی بات بتادوں مگر میں کیوں اپنی زبان خراب کرتا۔ میں نے جواب میں یہ کہہ دیا کہ اس قسم کا اندازہ لگانا ہی سراسر بیوقوفی ہے اور یہ کہ بعض اوقات بظاہر اچھا مقدمہ ہار جاتا ہے۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ حاکم کیا فیصلہ دیگا۔"

۴۸

وکیلوں کا قاعدہ ہے کہ جب مقدمہ میں موکّل کو یقینی طور پر سزا ہونے والی ہوتی ہے اصلاً وہ اس وقت موجود نہیں ہوتے۔ کم از کم کوشش یہی کرتے ہیں کہ موجود نہ ہوں چنانچہ یہی میں نے کیا۔ میں کچہری میں بالکل دوسری طرف چلا گیا کہ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ دھوبی پہلوان ہانپتے کانپتے چلے آرہے ہیں چہرہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں گھبرا کر جیسے ہانپ کر انھوں نے کہا۔ "غضب ہو گیا وکیل صاحب"!

میں نے کہا "خیر تو ہے"؟

وہ بولے "وہاں تو ایک سپاہی ٹہل رہا ہے"

میں نے کہا "تو پھر"

گھبرا کر بولے "اسکی جیب میں سے ہتکڑی کی رسی لٹک رہی ہے"

میں نے کہا "تم بھی عجب آدمی ہو سپاہی گھومتے ہی پھرتے ہیں۔ ہتکڑیاں لئے ہوئے"

کہنے کو تو میں نے کہدیا مگر واقعہ یہ ہے کہ جب کسی کو سزا کا فیصلہ سنایا

جاتا ہے تو ایک کانسٹبل کو ہتکڑی لیکر عدالت میں بلالیا جاتا ہے۔ میں نے سمجھا بجھا کر دھومی پہلوان کو واپس کر دیا اور وہ چلدئے مگر بمشکل پندرہ بیس قدم گئے ہونگے کہ پھر اس بات پر مصر ہوئے کہ میں بھی ان کے ساتھ چلوں محض اس وجہ سے کہ انہیں "ڈر لگتا ہے" مجبوراً ناچار میں بھی انکے ساتھ چلا۔

———— ۵ ————

مجھے چپکے سے پہلوان نے اشارہ کر کے کانسٹبل کو بتایا میں نے دیکھا کہ ایک تگڑا سا کانسٹبل داڑھی چڑھائے سُرخ آنکھیں کئے کھڑا ہے۔ مجبوراً مجھے بھی کانسٹبل کے پاس پہلوان کے ساتھ جانا پڑا۔ مشکوک نگاہوں سے قریب پہنچ کر پہلوان صاحب نے کانسٹبل کو دیکھا۔ کچھ رُک کر سلسلۂ گفتگو شروع ہُوا۔

پہلوان صاحب نے کہا۔ "جمعدار صاحب! آج ادھر کیسی ڈوٹی ہے"؟

جمعدار صاحب نے فرمایا" معلوم نہیں، چپراسی بلانے گیا تھا"

پہلوان نے پوچھا:۔" آخر کاہے کے لئے بُلایا ہے یہاں تو کسی کی ڈوٹی لگتی نہیں ہے"؟

جمعدار صاحب بولے:۔" ڈوٹی پھوٹی کاہے کی کسی چور بدمعاش کو شاید جیل کی جائیگی"!

اب سچ مچ میں نے دیکھا کہ پہلوان صاحب کے ہوش جلتے

سے رہے ہیں۔ مجھے الگ لیجا کر اظہار تشویش کیا اور پریشان ہو کر اپنا صافہ میرے جوتے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ خدا کے لئے مجھے لیجاؤ میں نہیں اطمینان دلا ہی رہا تھا کہ چپراسی نے آواز دی۔ میں نے چاہا کہ میں انکے ساتھ نہ جاؤں لیکن وہ بھلا چھوڑنے والے تھے۔

—— ۶ ——

مجسٹریٹ نے لاپروائی سے دھومی پہلوان کا نام لیا۔ پہلوان صاحب ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھے درحالیکہ بید کی طرح کانپ رہے تھے اور بڑی تیزی سے قرآنی آیتیں پڑھ رہے تھے۔ مجسٹریٹ نے بڑی سنجیدگی سے فیصلہ سُنایا۔ گویا بجلی گری۔ چھ مہینہ کی قید سخت اور سو روپیہ جرمانہ اور اگر جرمانہ نہ دیں تو تین مہینہ کی سزا اور۔ اِدھر فیصلہ سُنایا اور ادھر ایک ہائے کے ساتھ دھومی پہلوان رو پڑے اور گڑگڑا کر اور رو کر اور ہاتھ جوڑ کر فیصلہ میں رعایت کرانے کی نیت سے جو مجسٹریٹ سے دُہائی کرنا چاہی تو اس سے سپاہی نے روکا مگر رونے والا بھلا کب رُکتا ہے۔ مگر سپاہی تھا بیڈھب اس نے ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور یہ کہتے ہوئے کہ "ابے مرا کیوں جاتا ہے" ایک کھٹکے کے ساتھ ہتکڑی پہنا دی ۔

——

سالنامۂ مرمریں

تحریرات

الحمد للہ کہ ۱۹۳۴ء بخیر و خوبی ختم ہوگیا اور آپ کے مرمریں نے اپنی عمر کے پانچویں سال میں قدم رکھا۔ سال گذشتہ کی دشواریوں پر نظر رکھتے ہوئے بیجا نہ ہوگا اگر ہم اپنی مشکلات کے ساتھ ادبی خدمات کا بھی ذکر کریں۔ اس کساد بازاری کے زمانہ میں جبکہ ردی کا بھاؤ بیحد سستا ہے ہم مرمریں کا سالنامہ پیش کر رہے ہیں۔

جب سے آپ کا مرمریں شایع ہوا ہے برابر ادبی خدمات انجام دئے چلا جا رہا ہے۔ روکے نہیں رکتا۔ اس کی خدمات کا اندازہ اس سے بخوبی لگ سکتا ہے کہ اس طول و طویل عرصہ میں نہ تو راقم الحروف کبھی پولیس میں پکڑا گیا اور نہ کبھی مینیجر کو قید ہوئی۔

گذشتہ سال رسالہ کے صرف آٹھ دس نمبر منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہو کر ضیا پاشیاں نہ کر سکے جس سے پنساریوں کو سخت تکلیف پہنچی، اور ہم اپنے ان سرپرستانِ ادب سے معذرت خواہ ہیں، ساتھ ہی یہ بھی عرض کئے

دیتے ہیں کہ اب جو آپ کے مرمریں میں کاغذ استعمال ہو رہا ہے وہ پڑیاں باندھنے کے لئے نہایت ہی بے نظیر ہے۔

جہاں ہمیں اور دشواریوں سے سابقہ پڑا وہاں کاتبوں کا ذکر بھی لازمی ہے۔ ہمارا پہلا کاتب افسانہ نویس ہو گیا۔ دوسرا ایڈیٹر ہو گیا۔ تیسرے نے ہندی سیکھ لی اور چوتھے کی شادی ہو گئی۔ لیکن اب جو ہمیں کاتب ملا ہے گو وہ غلط لکھتا ہے مگر ویسے اُس کا کام نہایت ہی قابلِ اطمینان ہے ہمیں قارئین سے اُمید ہے کہ اگر کہیں مضمون یا افسانہ بیچ میں سے کچھ کا کچھ ملے تو وہیں کا وہیں حسبِ مرضی دل سے جوڑ کر لکھ لیں۔

بیجا نہ ہو گا اگر پریس کی دشواریاں بھی ہم بیان کر دیں۔ جس پریس میں آپ کا مرمریں پہلے چھپتا تھا اُس کے مالک نے رس گلّوں کی دکان کر لی۔ اور اب لڑنے پر آمادہ ہے۔ دوسرے پریس میں کام دیا تو اُنھوں نے لکھی لکھائی کاپیاں فروخت کر ڈالیں، بعد میں معلوم ہُوا وہ تو جُوتوں کا کاروبار کرتے تھے۔ یہ بھی لڑاکا نکلے۔ لیکن بحمداللہ کہ موجودہ انتظام قابلِ اطمینان کر لیا گیا ہے اور آپ کے ہر دلعزیز رسالے کے موجودہ پرنٹر گو ذرا چھاپتے خراب ہیں اور کام وقت پر نہیں دیتے مگر ویسے بیحد ملنسار اور متواضع ہیں۔

اکثر سرپرستانِ مرمریں رسالہ میں تاخیر کی شکایت کرتے ہیں ہم ان سے سخت شرمندہ ہیں مگر اُمید ہے کہ وُہ ہماری گوناگوں مصروفیتوں اور خانگی

مجبوریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں معذور خیال فرمائیں گے۔ گذشتہ چار ماہ سے میرا گھر بیماری نے دیکھ لیا ہے۔ رمضان کے اوائل میں قبلہ سوتیلے والدصاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا اور مجھے یتیم کر گئے۔ اس کے بعد آٹھوں نورچشمیاں بیمار ہوگئیں اور بہ اچھی نہ ہونے پائی تھیں کہ اُن کی تینوں پرنانیاں اس دارِفانی کو دارالمحن بنا گئیں اور جنت الفردوس کو سدھاریں۔

اکثر رسائل محکمۂ ڈاک کی نذر ہو جاتے ہیں اور ہمارے سرپرست بار بار ہم سے شکایت کرتے ہیں۔ ہم بارہا لکھ چکے ہیں اور پھر عرض کرتے ہیں کہ اس معاملہ میں بجائے ہم سے شکایت کرنے کے یہ کہیں بہتر ہوگا کہ اپنے مقامی ڈاکخانہ کے پوسٹ ماسٹر اور حلقہ کے پوسٹ مین کا صرف ہفتہ بھر انتظار کرنے کے بعد سر پھاڑ دیں ورنہ بصورت دیگر اس شکایت کے ہم ذمہ دار نہیں۔

بیجا نہ ہوگا اگر ہم قارئین سے کچھ شکایت بھی کریں۔ دراصل پرچہ کا وی پی۔ وصول کرنا ہر شخص کا مذہبی اور دنیاوی فرض ہے۔ لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ باوجود ہماری استدعا کے اکثر حضرات وی۔ پی۔ واپس کر دیتے ہیں۔ یہ نہ صرف اخلاقی جرم ہے بلکہ قومی زوال کی نشانی ہے اور ہم نہیں سمجھتے کہ ہمارے مقنن اس حرکت کو ان جرائم کی فہرست میں کب داخل کرینگے جو قابلِ دست اندازی پولیس ہیں۔ ہماری خاص شکایت اُن

حضرات سے ہے جن کو بغیر طلب کئے ہوئے وی۔پی۔ بھیجے جاتے ہیں دراصل مرمرین کا وی۔پی۔ وصول کرنا نہ صرف اس کا فرض ہے جس کو وہ طلب یا بغیر طلب کئے ہوئے بھیجا جائے بلکہ سارے محلہ کا فرض ہے اور ہم اُمید کرتے ہیں قارئین اس فرض کو جلد محسوس کرینگے۔

اس سلسلہ میں ہم اپنے اُن کرمفرماؤں کا خاص طور پر شکریہ ادا کرتے ہیں جنہیں غلطی سے دو دفعہ وی۔پی۔ روانہ ہو گیا اور اُنہوں نے وصول کر لیا۔ ہمیں اس غلطی پر افسوس ہے لیکن چونکہ ہمارے رسالہ کے قواعد کے مطابق قیمت وصول شدہ واپس نہیں کی جاتی لہٰذا اس کے متعلق خط و کتابت کوئی صاحب نہ فرمائیں۔

بعض حضرات اور معادنین ونامہ نگار ادبی خدمات کے سلسلہ میں اپنے مرمرین کی آنریری ایڈیٹری کی خدمات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جذبہ نہ صرف قابلِ تحسین ہے بلکہ اُردو صحافت کے لئے فالِ نیک ہے اور ہم تمام ایسے حضرات کی ہمت افزائی کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا آئندہ کے لئے ہم یہ حیرت انگیز سہولت پیش کرتے ہیں کہ جو بھی یکمشت پانچ خریدار دیگا اُس کا نام رسالہ پر بحیثیت آنریری اڈیٹر کے لکھ دیا جائیگا۔ اور پانچ سے زائد خریدار دینے کی صورت میں ایک افسانہ اور ایک ایڈیٹوریل نوٹ بھی اسکی طرف سے شائع ہوا کریگا۔

ایک حیرت انگیز رعایت اور ہم آپ کے مرمریں کو مقبول عام کرنے کے لئے پیش کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ اگر آپ اڑتالیس خریداروں کا سال بھر کا چندہ جمع کرکے بھیجدیں تو آپ کی خدمت میں برابر آپکی سات پشت تک رسالہ مفت بھیجتے رہیں گے۔

مرمریں کی ایک یہ بھی خصوصیت ہے اور رہیگی کہ اس میں مجموعی طور پر تمام رسالوں سے زیادہ رنگین اور سادہ تصویروں کا انتظام ہے۔ اب تک تو یہ انتظام تھا کہ تازہ ترین دیاسلائی کے بکس کا ڈیزائن فوراً اور جلد سے جلد لے لیا جاتا تھا لیکن اب ہم یہ خوشخبری سُناتے ہیں کہ ہم نے ہندوستان کے تمام دیاسلائی کے کارخانوں سے معاملہ براہِ راست طے کرلیا ہے اور اس بارے میں ہم یورپ کے کارخانوں سے بھی خط وکتابت کر رہے ہیں اور اب ہم ایک سے ایک بڑھ کر شاہکار پیش کرسکیں گے۔

ہم اپنے قلمی معاونین کے بیحد ممنون ہیں اور بالخصوص حضرت پنچی بڑ لوٹوی کے جنہوں نے اب کے مرمریں میں سب سے زیادہ مضمون اور افسانے لکھے۔ حضرت بڑ لوٹوی ایک پایہ کے ادیب اور افسانہ نگار ہیں۔ آپ ان کے مضامین کی بیہودگی اور خرابی پر نہ جائیے بلکہ آپ تو ان کا ادبی ذوق دیکھئے۔ ایک خصوصیت ان میں یہ بھی ہے کہ سوائے اپنے مرمریں کے آپ دوسرے رسالوں کو مضمون ہی نہیں دیتے۔ دراصل آپ کے مضامین

کی خوبی سوائے ہمارے کوئی دوسرا سمجھ ہی نہیں سکتا ہے۔

سال گذشتہ میں ہمیں افسوس ہے کہ ہمارا حصۂ نظم کسی قدر کمزور رہا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اتفاقات ناگہانی کے سبب اس طرف کچھ یکّہ پر بیٹھنا کم ہوا نتیجہ یہ کہ تمام وہ عمدہ غزلیں جو ہمیں یکّہ والوں سے مل سکتی تھیں نہ مل سکیں۔ پھر ہمارے قلمی معاونین بھی غالباً یکّوں پر کم بیٹھے۔

ہمارے جوائنٹ ایڈیٹر صاحب سوائے عمدہ مضامین لکھنے کے اور کچھ نہیں جانتے تھے، لہٰذا ہم نے ان کو علیحدہ کر دیا اور اب ہمیں ایک ایسے جوائنٹ ایڈیٹر کی ضرورت ہے جو اپنے سرمایہ سے اپنے مرمریں کی امداد بھی بغیر کسی صلہ کے کر سکے اور ہندوستان بھر میں اپنے مرمرین کا پروپیگنڈا کرے اور تمام دنیا کے ایڈیٹروں سے تبادلۂ خیالات کرنیکے لئے اپنے خرچہ پر سفر کر سکے اور سب خریداروں سے بھی ملے اور نئے خریدار بھی پیدا کر سکے۔ اس ادبی خدمت کے عوض میں ہم اُن کے سڑے بُسے مضمون سب چھاپ دینگے۔ اور بار بار اُن کا شمار افسانہ نگاروں میں بھی کرینگے۔

ہم اپنے معاونین کی توجہ ان کے مرمریں کی ضخامت کی طرف دلا کر داد لینا چاہتے ہیں۔ اچھے اور عمدہ پڑیاں باندھنے کے کاغذ کے ۷۵ صفحات کے اشتہارات قارئین کی خدمت میں ہر ماہ پیش کرنا معمولی بات نہیں ہے۔ خاص نمبروں کی آج کل وبا عام ہے۔ لیکن ایک بھی آپ کے

مرمریں کی گرد کو نہیں پہنچتا۔ یوں تو آپ کے مرمریں کا ہر معمولی نمبر بھی ملک کے دوسرے رسالوں کے خاص نمبروں سے کہیں بڑھا چڑھا ہوتا ہے۔ لیکن مرمریں کے آئندہ خاص نمبر خود گذشتہ خاص نمبروں سے بڑھے چڑھے ہونگے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ سال رواں میں سولہ خاص نمبر نکالیں۔ یہ خاص نمبر مرمریں کے موجودہ چندہ میں نہیں دئے جا سکتے لہٰذا ہر نمبر کی قیمت عہ ہوگی اور یہ انتظام کیا گیا ہے کہ ہر نمبر تیار ہوتے ہی ہر خریدار اور اس کے سارے محلّے اور سسرال والوں کو دی۔پی۔ کر دیا جائے۔

اشاعت کے بارہ میں ہم مسرت کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ آپ کے مرمریں کی اشاعت اس وقت سب رسالوں سے زیادہ ہے لیکن اگر ہر خریدار کم از کم اڑتیس خریدار اور دیدے تو موجودہ اشاعت سچ مچ دوگنی ہو جائے اور پھر ہم اسی چندہ میں قارئین کو دوگنی ضخامت کے اشتہار دے سکیں گے۔

ہمارے قلمی معاونین کی ایک یہ خصوصیت ہے کہ آپ ان کے افسانے اور شاہکار وغیرہ کسی دوسرے رسالہ میں نہیں دیکھیں گے۔ یہ مرمریں ہی کی خصوصیت ہے جو اور کسی رسالہ کو میسّر نہیں اور ہمیں فخر ہے کہ مرمریں کو ہندوستان کے بہترین قلمی معاونین مل گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم آپ سے داد لینا چاہتے ہیں کہ یہ سب ہماری محنت اور آپ کی امداد کا نتیجہ ہے

اور ہم ہمیشہ اسی کوشش میں رہتے ہیں کہ ملک کے بہترین ادیب آپ کے مزمریں کے لئے اپنی خدمات وقف کر دیں۔ بعض معاونین معاوضہ کے متعلق طول طویل خط وکتابت کرتے ہیں۔ ہم جملہ معاونین کو یقین دلاتے ہیں کہ ہمارے معاوضہ کے شرائط بہترین ہیں اور ہم آج کل اپنے بعض معاونین سے مضامین کا جو معاوضہ چارج کر رہے ہیں وہ ہندوستان کے کسی رسالہ کے نرخ اشتہارات کے نصف سے بھی کم ہے۔ اس سے زیادہ ہمت افزائی سے ہم معذور سمجھے جائیں۔

ملک کے مایۂ ناز ادیب اور افسانہ نگار و مزاحیہ نگار حضرت مآخوذ سے کون حامیٔ ادب ناواقف ہوگا۔ آپ کے شاہکاروں سے اکثر بیشتر رسائل مالا مال نظر آتے ہیں اور آپ ہی ایک ایسے ادیب ہیں جنکے مضامین ہر موضوع پر لے لیجئے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ باوجود ہماری انتھک کوششوں کے حضرت موصوف ابتک لاپتہ ہیں اور آپ کا پتہ معلوم کرنیکی ہماری تمام کوششیں ابتک رائیگاں گئیں۔ لہذا اس تحریر کے ذریعہ ہم حضرت موصوف کو اپنے صفحات کی طرف خاص توجہ دلاتے ہیں حضرت موصوف کا پتہ قریب قریب ہمارے تمام معاصرین ہی جانتے ہیں اور ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے جملہ معاصرین نے باوجود ہمارے بار بار لکھنے کے ہمیشہ خاموشی سے کام لیا۔

مصنفین کی خدمت میں التماس خاص ہے کہ ریویو کا بہترین انتظام

انکے مرمریں میں برابر رہا ہے لیکن بعض حضرات کو شکایت بھی ہے۔ لہٰذا اسال رواں سے ہم نے اور انتظام کرلیا ہے۔ وہ یہ کہ بجائے ایک کاپی کے مصنفین ہر کتاب کی اٹھارہ کاپیاں بھیجا کریں تاکہ ہماری ہر میز اور ہر چارپائی پر کتاب کی کاپی ہر وقت رہ سکے اور اُس پر قریب ترین اشاعت میں ریویو ہو سکے۔

بیجا نہ ہوگا اگر ہم کچھ مرمریں بکڈپو کے بارہ میں بھی عرض کریں مرمریں بکڈپو اپنی خوش معاملگی میں اپنی نظیر آپ ہے، جملہ مصنفین کی کتب پچانوے فیصدی کمیشن پر لیجاتی ہیں اور پائی پائی کا حساب رکھا جاتا ہے چنانچہ جسکا جی چاہے دیکھ لے، جسکے دام بھی بکڈپو کی طرف نکلتے ہیں وہ جوں کے توں آجتک موجود ہیں اور ایک پائی "اِدھر" سے "اُدھر" نہیں ہوئی ہے۔

سالِ رواں کیلئے ہمارے پیشِ نظر آپکے مرمریں کی دلچسپیوں کیلئے ایک نہایت ہی شاندار اور ہیبتناک پروگرام موجود ہے جسکے بارہ میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے شائقینِ ادب خود دیکھ لینگے۔ ابھی ہم اپنی زبان سے کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ یہ ہمارا ادبی فرض ہے اور اسے ہم پر چھوڑ دیئے، آپ تو صرف ہماری مالی مشکلات کی طرف توجہ رکھئے۔ ہم نے آپ کے مرمریں کیلئے اپنی جان اور اپنا مال وقف کردیا ہے اور اپنا سب کچھ رسالہ پر سے قربان کردیا ہے صحت اور روپیہ سب ہی کچھ قربان کرچکے ہیں تین چار دفعہ پٹ بھی چکے ہیں۔ اگر آپ نے اس طرف توجہ نہ کی تو ہمیں اندیشہ ہے کہ بہت جلد آپکے مرمریں کے اس جانباز مالک و ایڈیٹر کا دیوالہ نکلجائیگا۔ آٹھ دفعہ عدالت دیوانی کی قرقی آچکی ہے اور اب اس خادم کے پاس کچھ نہیں جو قرض ادا کرسکے۔

آپکا اور آپکے مرمریں کا خادم "اڈیٹر"

ادبیات

بشنوئی[1]

رانڑاوت جی[2]! رانڑاوت جی! رانڑاوت جی!

میں نے قسم کھائی تھی کہ روزانہ صبح اُٹھ کر ایک سو دفعہ رانڑاوت جی

کا نام لونگا!

کیوں؟

اس لئے کہ رانڑاوت جی جب مجھ سے باتیں کرتی ہیں۔

تو معلوم ہوتا ہے کہ محبّت کی پریاں اپنا گیت گا رہی ہیں اور اُن کی

میٹھی میٹھی سانسوں سے ایک عالم معطّر ہو رہا ہے۔

اس لئے کہ رانڑاوت جی جب میری طرف دیکھتی ہیں۔

تو میں غور سے دیکھتا ہوں کہ اُن کی آنکھوں میں جوانی اور محبت کی

---

[1] بشنوئی مارواڑ کے ریگستانی علاقہ کی ایک قوم ہے جو ہرن کی پرستش کرتی ہے اور اُنکے فلسفہ کو سمجھنے کی میں نے کوشش کی ہے۔

[2] لڑکی کا نام قبیلہ کے نام سے ملا کر بناتے ہیں۔

پریاں ناچ رہی ہیں.........

آنکھ کی ہر جھپکی کے ساتھ دل میں اُن کے ناچ کے "چھما کے" کی جنبش پہنچتی ہے۔

اِس لئے کہ رانڑا دت جی سے مجھے عشق ہے۔

اس لئے کہ رانڑا دت جی کو مجھ سے عشق ہے۔

—— : ۲ : ——

ابھی دھوپ سے ریگستان کے ذرّے نہیں چٹخے تھے۔

اور نہ ریگستان کے پُرنور سینہ پر ہوا کی جُنبش کے ساتھ دُھواں اُٹھتا معلوم ہوتا تھا۔

بلکہ ریگستان کے سمندر میں رات کو ہوا بہنے سے جو لہریں بنی ہوئی تھیں اُن میں سے ایک بھی نہیں بگڑی تھی۔

پاس ہی باجری کا ہرا بھرا کھیت تھا۔

—— : ۳ : ——

باجری کا کھیت!

بالیں جھُوم رہی تھیں۔

پتّے ریگستانی گیت گا رہے تھے۔

کچھ تالیاں بجا رہے تھے۔

اور کھیت کے ایک کونے پر کیجڑی[1] کا درخت کھڑا ہوا سیٹی بجا رہا تھا
کیا ہی خوش منظر تھا! میں نے باجری کے کھیت کی طرف دیکھا۔

—— : ۴ : ——

موٹھ کی جھاڑیاں راٹھوڑی[2] پینچ کی طرح بل کھائی ہوئی تھیں۔
اور پھلیاں خوشی سے دانت نکالے ہنس رہی تھیں۔
سامنے ریگستان موجیں مار رہا تھا۔
"رانڑاوت جی!" میرے مُنہ سے ایک بیخودی کے عالم میں نکلا!
اُفوہ! میرے دل میں نوجوانی کی بھڑکن تھی!
میں دوڑ رہا تھا۔

—— : ۵ : ——

دوڑ رہا تھا اور ناچ رہا تھا۔
کمٹھے[3] کا ناچ ناچ رہا تھا۔
میں کمٹھا اچھال رہا تھا۔
رانڑاوت جی! رانڑاوت جی! میں کمٹھا اچھال رہا تھا۔
رانڑاوت جی! رانڑاوت جی!

۱؎ ایک درخت جو اُس طرف کثرت سے ہوتا ہے ۲؎ راٹھوروں کے صافہ کی بندش، ۳؎ کمٹھا بمعنی کمان۔ یعنی جنگی ناچ۔

ریگستان کی سوندھی سوندھی خوشبو میرے ساتھ گھوم رہی تھی۔
نرم نرم ریت کی میٹھی میٹھی ٹھنڈک میرے ساتھ گھوم رہی تھی۔
نرم نرم ٹھنڈک پیر کے تلوؤں سے دماغ پر چڑھ رہی تھی۔
نرم نرم ٹھنڈک آنکھوں کی چمک بن کر نکل رہی تھی۔
سامنے ریگستان ناچ رہا تھا۔
اُس کے پار۔ افق کے پاس کوہ اراولی کے بچے ناچ رہے تھے۔
میں ناچ رہا تھا۔
میرے نوجوان دل میں عشق کی دھڑکن تھی۔

—————— ۶ ——————

میری نوجوان رگوں میں محبت کا پگھلا ہوا روپا[1] دوڑ رہا تھا۔
رانڑا وت جی کی محبت کا خیال آیا۔
دل کے اندر کسی نے انگڑائی سی لی۔
ایک میٹھا سا درد بل کھاتا ہوا اُٹھا۔
پھر دل میں جلد ہی جلدی ریت سی سرکتی معلوم ہوئی۔
سارے بدن میں محبت کی سنسنی پھیل گئی۔
پُر درد لہجہ میں میرے مُنہ سے نکلا۔
"رانڑا۔۔۔۔۔۔ وَت۔۔۔۔۔۔ جی"

---

[1] چاندی

ـ ۷ ـ

رقیب!

میرے دل میں رقیب کا خیال آیا۔
کمٹھا کندھے پر بیقراری سے تڑپتا اور بل کھاتا معلوم ہُوا۔
اور خود بخود جُھکنے کے لئے بیقرار معلوم ہُوا۔
پگڑی میں ایک بُجھا ہُوا خونی تیر تھا۔ اور پگڑی ہاتھ کو اپنی طرف کھینچنے لگی۔

میرے تن بدن میں غصہ کی سنسنی پھیل گئی۔
رگوں میں محبت کی پگھلی ہُوئی چاندی کے بجائے غصّہ کا سیسہ دوڑنے لگا۔

سینہ اُبھرنے لگا، اور بازو کُشادہ ہونے لگے۔
کمٹھا جُھکنے لگا اور اُس کی تانت لرزنے لگی۔

میں غصّہ کے مارے ہانپ رہا تھا۔
"میں اُس کو قتل کر دونگا!" ناچتے ہوئے پتّوں کو میں نے غصّہ میں کمٹھا دکھا کر کہا۔ "میں اُس کو قتل کر ڈالونگا۔ قتل کر ڈالونگا!"
دفعتہً ڈر کے مارے یہ ناچتے ہُوئے پتّے کھیت کی مینڈ پر سے گھومتے ہُوئے میدان کی طرف بھاگے،

ریگستان کے ننھّے ننھّے ذرّوں نے اپنی بساط کے موافق کود کود کر اور
اُچھل اُچھل کر پتّوں کو پکڑنے کی کوشش کی۔ یا مارنے کی۔
سامنے یہ گستاخ پتّے ریگستان کے صاف شفاف سینہ پر جم کر ناچنے
لگے، اور ریت کے ذرّوں نے اُنہیں مارنا شروع کیا۔
یہ کِس کے حمایتی ہیں؟ میرا مذاق اُڑاتے ہیں!

——— ۸ ———

میں نے غصّہ سے ایک جنگی "ہونکارے" کے ساتھ گستاخوں کو ڈپٹا۔
میری آنکھوں سے چنگاریاں اُڑ رہی تھیں۔
میں اُس کو مار ڈالوں گا۔
میں نے کمٹھے کو اپنے پیروں سے خم کرکے زہ کیا۔
صافہ سے بجھا ہُوا تیر نکالا۔
اُس خونی تیر کو ایک بوسہ دیا اور کمٹھے میں جوڑ کر بایاں ہاتھ بالکل
سیدھا کرکے اور داہنا خم کرکے چُٹکی کو کان تک گھسیٹ کر چھوڑ دیا۔
"ٹُوانگ"....... شائیں....... چ.......!
تانت کے جھنّاٹے کے ساتھ "شائیں" سے تیر نکل گیا اور "چ"
سے ریت میں گھُس گیا۔
گستاخ پتّے!

خوشی سے دیوانہ وار وہ تیر کی آمد پر اُس کے اِرد گرد پرا باندھ کر اور بھی تیزی سے ناچنے لگے۔

میں احمق ہوں۔

میرے نوجوان سینہ سے ایک قہقہہ نکلا جس کی آواز کوہ اراولی کے دامن تک پہنچی ہو گی۔

میں احمق ہوں، اور گاتا ہُوا دوڑا۔

———:۹:———

تیر کو زمین سے کھینچا ہی تھا کہ . . . .

کالا ہرن!

اُس کی سیاہی سُورج سے جھگڑنا چاہتی تھی،

اُس کی پُشت پر جہاں سیاہی سے سُورج کی سفیدی ملتی تھی۔ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ چاندی چمک رہی ہے۔

میرے مُنہ سے نکلا "شکار!"

رانڑا دت جی نے کالے ہرن کے شکار کو کہا تھا!

رانڑا دت جی ہرن کے شکار کی بیحد شوقین ہیں۔

———:۱۰:———

کمٹھے کی تانت پھر لرزنے لگی۔ پہلے غصّہ میں لیکن اب خوشی کی وجہ سے۔

کمٹھے کی تانت شکاری گیت گا رہی تھی۔

خونی گیت!

میرا دل بھی گانے لگا۔

---: ۱۱ :---

میں نے تیر کی نوک پر سے ریت صاف کی۔

اُس کی نوک پر چمک کی وجہ سے سفیدی تھی۔

تیر نے کہا کہ: "میں رانڑا دت جی کی محبت کی طرح اُجلا اور صاف ہوں"

جھوٹا کہیں کا۔ مگر........

دوست اور دُشمن کے ساتھ ایک سلوک کرتا ہے۔

اس کالے ہرن اور میرے رقیب دونوں کا خون اس کے لئے

ایک ہے۔

یہ خونی ہے۔ خونی۔

مگر اس کے دامن پر خون کا دھبّہ نہیں ہے۔

موت کا پیام بر!

---: ۱۲ :---

پھر میں نے تیر کو جوڑا۔

اس کی روانی کو انگلی کی گھائی میں سرکا کر دیکھا۔

ہرن دُور تھا اور میں بیٹھ گیا۔

کمٹھے کے بیچوں بیچ میں لمپنے دونوں پیر میں نے اَڑا دئے، اور دونوں ہاتھوں سے تانت میں تیر پھنسا کر اُس کو پورے زور کے ساتھ کھینچا۔

اتنا کھینچا کر میں لیٹ گیا۔

ہرن کے سینہ پر شست لی اور تیر چھوڑ دیا۔

:۱۳:

موت کا پیام بر!

تیر ایک شعلہ کی طرح سناتا ہُوا موت کا پیغام لیکر پہنچا۔

ایک خونی جھپٹ کے ساتھ ہرن کے سینہ میں تراز دہو گیا۔

اُدھر وہ تڑپ کر گرا ہے اور اِدھر میں تڑپ کر اُٹھا ہوں۔

تڑپے تو دونوں تھے۔

:۱۴:

ہرن چوٹ کھا کر گرا تھا۔ مگر اُٹھ کر بھاگا اور میں رنجیدہ ہُوا۔

مگر تیر آدھے سے زیادہ باہر تھا اور پھر اُس کی جُنبش!

تیر کی "کھٹک" نے ہرن کو بیٹھنے پر مجبور کر دیا،

تیر کی کھٹک بڑی ہوتی ہے۔

---

[۱] کمٹھا دونوں پیروں اور دونوں ہاتھوں سے اب بھی چلایا جاتا ہے۔

ہوا سے جنبش کھا کر تیر کا کھٹکنا!

—— : ۱۵ : ——

میں اپنے شکار کے پاس خوش خوش دوڑ کر پہنچا۔
مگر حیف صد حیف!
میں نے اپنے شکار کو دیکھا!
میں نے خون کے شرّاٹے کو دیکھا۔
میں نے پیاسی ریت کو خون پیتے دیکھا۔
میں نے خونی چاندی چمکتی دیکھی۔
میں نے اپنے قاتل کو دیکھا!

—— : ۱۶ : ——

اے میرے شکار . . . . ہرن۔
اے میرے مقتول ہرن۔ یعنی میرے قاتل۔
میں نے اپنی نوجوان آنکھوں سے دیکھا۔
میں نے تجھے کھُریاں رگڑتے تکلیف میں دیکھا۔
میں نے تیرے سینہ میں تیر کی بیرحم نوک پیوست دیکھی۔
اُس کی نوک تیرے سینہ کے اندر کیسی کھٹکتی ہوگی،
تو نے میرا کیا بگاڑا تھا۔

مگر رانڑا دت جی . . . .

—————— : ۱۷ : ——————

میں نے دیکھا کہ بجھے ہوئے تیر نے تیرے تن بدن میں ایک آگ پھونک دی ہے۔

ایک درد و کرب کی دہکتی ہوئی انگیٹھی تیرے بدن کے اندر روشن ہے!

تُو درد کی شدت اور تکلیف کی گرمی سے پھُنکا جا رہا ہے۔

جانکنی کی تکلیف تجھ پر کیسی سخت ہے۔

مگر رانڑا دت جی . . . .

—————— : ۱۸ : ——————

اے میرے قاتل۔

میں نے دیکھا کہ تو نے اپنی نوجوان آنکھوں کو میری طرف پھیرا۔

یہ تیرا پہلا حربہ تھا۔

اُن آنکھوں میں درد کی شدت کی پھڑکن تھی۔

اُن آنکھوں میں شکایت کی جلن تھی۔

نوجوانی بجھ رہی تھی۔

رعنائی کا گلا گھُٹ رہا تھا۔

خود جوانی سکرات کے عالم میں تھی ۔
موت کی سختی جھلک رہی تھی ۔
میری موت آرہی تھی ۔

———— :۱۹: ————

اے میرے قاتل !
میں نے تجھے پھر غور سے دیکھا۔
تکلیف کی شدّت ہر بال اور رونگٹے سے عیاں تھی ۔
انتہائی کرب اور بیچینی سے تیرے ہونٹ سُکڑنے لگے۔
جانکنی سے ہونٹوں میں سکڑن پیدا ہوئی ۔
انتہائی شدّت کے ساتھ سخت تکلیف سے ہونٹوں نے بل کھائے
ایک فریاد تیرے مُنہ سے نکلی ۔
میں نے اُس وقت تیری جھپکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھا۔
اُن کھڑکیوں میں سے موت جھانک رہی تھی ۔
مَیں نے موت کی نیند کو تیری آنکھوں میں بستے دیکھا۔
مگر رانڑاوت جی . . . . . ؟

———— :۲۰: ————

لیکن، الامان !

تو نے مجھے قتل کر دیا!

اپنی اُن آنکھوں سے جن میں درد اور ٹیسوں کی بجلیاں چمک رہی تھیں!
اپنے اُن کپکپاتے ہونٹوں سے جو تکلیف اور انتہائی تکلیف کا اظہار
کر رہے تھے۔

تُو نے اپنے قاتل کو خود قتل کر ڈالا!

—— : ۲۱ : ——

کس قدر خوفناک منظر تھا۔

کوہ اراولی کے دیوزاد بچّے!
ریگستان کا ہیبتناک سینہ خاک اُڑا رہا تھا!
ہوا دندناتی آ رہی تھی اور دُھول اُڑ رہی تھی۔
کھیجڑی کے پتّوں میں غصّہ کی چرچراہٹ تھی!
باجری کی بالیں سر پٹخ رہی تھیں!
پتّے ماتم کر رہے تھے!
موٹھ کی جھاڑیاں مارے غصّہ کے بل کھا رہی تھیں!
موٹھ کی پھلیاں سچ مچ رو رہی تھیں!
کس قدر خوفناک منظر تھا!
میں تجھے مرتا دیکھ رہا تھا۔

میری روح میں موت کی خوفناک ٹھنڈک بیٹھتی جا رہی تھی۔

آہستہ آہستہ!

آہ میں مرا!

تُو نے مجھے قتل کر دیا۔

گرتے ہُوئے میں نے کہا "ہائے میں مرا!"

———: ۲۲ :———

میری جان سے پیاری رانڑا دت جی۔

میرے دل کی مالک رانڑا دت جی۔

وہ میری لاش پر کھڑی تھی۔

اُس کے خوبصورت چہرے پر۔

حُسن کی پریاں ناچ رہی تھیں۔

تبسّم کی بجلیاں چمک رہی تھیں۔

نُور کی بارش ہو رہی تھی۔

نوجوانی کا پھُول کھِلا ہُوا تھا۔

مگر میں؟

ہائے میں مُردہ تھا۔

———: ۲۳ :———

اُس نے مُسکراتے ہوئے مجھے دیکھا۔

نوجوانی اور حسن و محبّت نے مجھے مُسکراتے ہوئے دیکھا۔

میرے قاتل کی طرف اُس نے خوش ہو کر اُنگلی اُٹھائی اور پوچھا۔

"اس کو تم نے مارا ہے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ اور اِس نے مجھے مار ڈالا!"

اُس نے محبّت سے میری طرف جُھک کر کہا۔

"میں تم سے محبّت کرتی ہوں"

میں نے جواب دیا۔

"مُردے نہ کسی سے محبّت کرتے ہیں اور نہ اُن سے کوئی محبّت کر سکتا ہے"

ٹھیس

میر انیسؔ کے ایک شعر کی تشریح

میر صاحب فرماتے ہیں۔ ع۔ "انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو"
اس مصرعہ کی فصاحت اور تخئیل کی لطافت کا صحیح اندازہ لگانا ہو تو "ٹھیس" اور "آبگینہ" کے الفاظ پر غور کیجئے۔ میری دانست میں لفظ "ٹھیس" کی نزاکت استعمال کی یہ اعلیٰ ترین مثال ہے اور جب ہم اس شعر کے مصرعہ اولیٰ کی طرف توجہ کرتے ہیں تو لفظ "ٹھیس" کی فصاحت اور نزاکت استعمال کو دیکھتے ہوئے میر صاحب کو "خدائے سخن" کہنا پڑتا ہے۔ ذرا غور کیجئے ؎

خیالِ خاطر احباب چاہیئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

ٹھیس اور چوٹ میں نہ صرف لغوی بلکہ میری دانست میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ چوٹ سے نزاکت مفقود ہے۔ دراصل آبگینہ کے لئے چوٹ کا تخئیل ہی ایک ہتھوڑا ہے۔ ٹھیس میں ارادہ کے فقدان کے ساتھ لاعلمی

کا عنصر زبردست ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انصال یا تصادم جو نازک سے نازک چوٹ کے لوازمات ہیں قطعی معدوم ہیں۔ یوں سمجھئے کہ چوٹ میں اگر شائبہ مادّیت موجود ہے تو ٹھیس اُس کے آگے محض ایک تخئیل رہ جاتا ہے۔ ٹھیس اور چوٹ میں یہ بھی فرق ہے کہ ٹھیس جس کے لگتی ہے اُس کے لئے تو قیامت ہے اور جس سے لگتی ہے اُس کو بسا اوقات اس کا علم بھی نہیں ہوتا۔ یہ بھی ٹھیس کی خصوصیات میں سے ہے کہ اُس کے مُہلک اثرات کے نتائج پر جس سے ٹھیس لگتی ہے وہ نہ صرف متعجب ہوتا ہے بلکہ اکثر مُنکر۔ جس سے ٹھیس لگتی ہے وہ عموماً بے قصور بھی ہوتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات قابلِ رحم بھی ہوتا ہے۔ یہ بھی قابلِ غور بات ہے کہ عموماً ٹھیس ایسے لگتی ہے کہ اُس کا شُبہ بھی نہیں ہوتا۔ غفلت اور لاپروائی کا سوال ہی نہیں آتا۔ شاعر نے لفظ "ہردم" جو استعمال کیا ہے وہ اس سوال سے قطع نظر کر کے استعمال کیا۔ اگر ہر وقت کا یا اور اسی قسم کے لفظ کا استعمال ہوتا تو اس سوال کی گنجائش تھی۔ لیکن لفظ "ہردم" تو سوتے اور جاگتے پر حاوی ہے۔ شاعر نے دراصل اس کے ساتھ "دُم" کی قید لگائی ہے تو اسی لئے کہ لاپروائی اور غفلت کا سوال ہی اُڑ جائے۔ اور یہ مبالغہ آفرینی شعر کی بلاغت تخییّل پر دال ہے۔

مگر عرض ہے کہ اس شعر کی بلاغتوں اور فصاحتوں کا پتہ کس مسخرے

کو تھا جو آج بیٹھ کر اس کی تشریح کرتا اور اصل پوچھئے تو گرہ میں اتنی قابلیت بھی نہیں جو کوئی بُرا یا بھلا شعر اپنی سمجھ میں آسکے۔ اور پھر اس شعر کے سمجھنے کے لئے نہ معلوم کیا کیا چاہئے۔ آبگینہ بھی ہو۔ کوئی حادثہ یا واقعہ بھی ہو اور پھر ٹھیس بھی لگے۔ اور جو ٹھیس لگنے سے آبگینہ نہ پھوٹا تب بھی شعر کے معنی سمجھنا رہ گئے۔ مگر تقدیر میں اس شعر کو سمجھنا لکھا تھا اور وہ بھی عجیب و غریب طریقہ پر۔ لہذا بطور اتمام حجت یا بطور تشریح آپ کو ایک بدمزہ قصہ سناؤں۔

۔۔۔ ۱ ۔۔۔

جب ہمارے دوست ہمت حسین کی شادی ہوئی تو ہم نہیں کہہ سکتے مارے خوشی کے کیا حال ہوا۔ دراصل اس شادی میں شرکت کی اور بے حساب لطف اٹھائے مگر سچ پوچھئے ہیں تو حیران بھی اس میں اتنا ہونا پڑا کہ بیان نہیں کر سکتے۔ اور دراصل شادی کے بعد ہم تو غافل ہی ہو گئے تھے کہ اور ہی معاملہ پیش آیا۔

۔۔۔ ۲ ۔۔۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ کلاس میں پہنچے۔ ایک دوست سے پوچھا کہ یار ہمت حسین نظر نہیں پڑتا۔ پھر خیال آیا کہیں اکیلے اکیلے بے ایمان کچالونہ کھا رہا ہو۔ یہ خیال آتے ہی وحشت سی ہوئی اور دوڑے ہی تھے

کر ایک اَور دوست گویا پھاند کر پہنچے ہیں۔ حواس باختہ آنکھیں پھٹی ہوئی۔ ہوش زائل۔ حلق پھاڑ کر کہتے ہیں۔ "ارے یا.... آر ہمت حسین کے لڑکا ہُوا ہے"

واللہ! غضب ہو گیا۔ ذرا غور تو کیجئے لڑکا ہُوا ہے! میرے مُنہ سے نِکلا "ارے! کب۔ کیسے؟...... اماں کب؟ ہم نے سُنا بھی نہیں!.....

بدمعاش کہیں کا......... ہم سے کہا بھی نہیں...... پتہ تک نہیں...."

معلوم ہُوا ابھی ہُوا ہے۔ یعنی ابھی ہی سمجھو۔ ہُوا ہو گا صبح کے وقت غرض عرضی آئی ہے کہ میرے لڑکا ہُوا ہے میں کلاس نہیں آسکتا۔ ذرا غور تو کیجئے اس نوزائیدہ لڑکے کی سعادتمندی پر۔ پیدا ہوتے ہی باپ کو چھُٹی دلائی

ہم دونوں دوستوں نے لڑکا ہونے کے امکان ہی پر جو غور کیا ہے۔ تو پھر اُچھل پڑے: "واللہ غضب کی بات ہُوئی یہ تو......"

قصّہ مختصر۔ کہاں کا اسکول۔ کیسا کلاس۔ بھاگے ہم دونوں کلاس سے ہمّت حسین سے ملنے۔ یعنی مطلب یہ کہ چلو دیکھیں تو سہی ذرا ہمت حسین کو یہ دیکھیں کہتا کیا ہے!

—— ۳ ——

سیدھا میں گھر پہنچا۔ کیا دیکھتا ہوں بھابی جان اونگھ رہی ہیں چارپائی پر۔ حلق پھاڑ کر میں چلّایا: "بھابی جان ہمّت حسین کے لڑکا ہُوا ہے...."

"چولھے میں جائیں ہمّت حسین...." بھابی جان نے چونک کر

کہا:" اے ہے میں ڈر گئی۔ میں کیا کروں لڑکا ہوا ہے تو.........."

خیر، میں نے دل میں کہا اور چپ ہو گیا۔ یہ سوچا کہ دیکھو تو۔ ان کی تلخ مزاجی۔ ابھی جو کہیں خود موہن سلمہٗ کے بھائی "منعقد" ہوتب......! یا نہ سہی خود ان کی کسی ملنے والی کے یہاں یا پھر بھائی صاحب کے کسی دوست کے یہاں جو چوہیا کا بچہ بھی ہوتا تو دوڑی دوڑی پھرتیں۔ خیر، یہ تو ہیں ہی ایسی۔

اب ہم دونوں دوست چلے ہمت حسین کے گھر۔ یہ سوچتے کہ بھئی ملیگا تو آخر کہیگا کیا؟ کیا کر رہا ہوگا بیٹھا؟ اور ہم کیا کہینگے اُس سے؟ ظاہر ہے کہ ہم اُس سے کہہ ہی کیا سکتے تھے۔ سوائے اس کے کہ ہنسیں اور کہیں کہ "ابے یہ کیا؟......" دراصل ہم خود عجب چکر میں تھے۔ سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔ دراصل کبھی اس قسم کی گڑبڑ سے اپنا سابقہ ہی نہ پڑا تھا۔ دیکھا جائے تو خوشی بھی ایسی تھی کہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ ایسی کہ عقل کام نہ کرتی تھی کہ فی الحال کیا کریں۔ قصہ مختصر اسی قسم کے دل میں خیالات موجزن اور ہم پہنچے۔

جیسے ہی ہم پہنچے ہمت حسین نے اپنے کمرہ کی کھڑکی میں سے ہم لوگوں کو دیکھا اور ہنسے۔ ہم دروازہ ہی پر سے چیخے "کیوں بے........" گھبرا کر اُس نے داہنی طرف باہر اشارہ کیا۔ "اَرے"! دراصل ہمت حسین کے والد صاحب بیٹھے تھے۔ جمعہ کا دن تھا، سر گھٹا چکے تھے۔ بیٹھے لبیں کٹوا رہے

تھے ہم نے انہیں ملنے خوشی کے دیکھا ہی نہیں۔ خیر ہم نے جھٹ سے سلام کیا۔ باغ باغ ہو رہے تھے کہنے لگے "بھئی بھتیجا مبارک ہو۔" ہم لوگ دراصل شرما گئے۔ موقع ہی کچھ عجیب خوشی کا تھا۔

کمرہ میں جو پہنچے وقت ہمت حسین پر پھیل پڑے مارنے۔ "ابے یہ کیا؟ ...... ارے بیہودہ یہ کیا ہ ...... ہمیں پتہ تک نہیں ...... معلوم تک نہ ہونے دیا! ...... بھئی واہ ...... خوب ...... تو نے تو کمال ہی کیا ......"

پھر ہم نے پوچھا کہ بچہ ہے کیسا۔ معلوم ہوا بہت خوبصورت ہے۔ دیکھنے کا خیال گذرا۔ ایک کانی سی لڑکی دروازہ سے جھانک رہی تھی اُس سے ہمت حسین کی والدہ کو سلام کہلایا اور بھتیجے کو دیکھنے کے ارادہ کا اظہار کیا وہ چڑیل واپس آئی تب معلوم ہوا کہ بھلا تیسے بچے کا دیکھ کر ہم کیا کرینگے یہ پتہ چلا کہ دیکھتے ہی ایک روپیہ کم از کم دینا ہوگا۔ دل میں ہم نے کہا کہ "پھر دیکھیں گے اسے" اور ابھی سچ پوچھئے تو دیکھنا ہی کیا۔ ہم دونوں نے ہمت حسین سے مٹھائی کھائی۔ اُس کے بعد ہمت حسین کے والد صاحب آئے لڑکے کا دراصل نام تجویز ہونا تھا۔ اُن کی مرضی تھی کہ لڑکے کا نام مصطفےٰ کمال رکھا جائے۔ دراصل وہ مصطفےٰ کمال پاشا کے زبردست حامیوں میں تھے اور وہ بھی ایسے کہ لبا اوقات ہم لوگ سنجیدگی سے یہ سوچتے تھے کہ موجودہ ٹرکش

گورنمنٹ اور اس کا بہادر صدر یورپ کو توخیر دق کر سکتا ہے۔ اس کا ذکر جانے دو۔ سوال یہ تھا کہ ہمارے وجود کے لئے کتنا پریشان کن ہے۔ مانتے ہیں ہم کہ اُنہوں نے اسلام کے دشمنوں کو مار ڈالا مگر اس کے یہ معنی تو نہیں کہ اب باقی مسلمان جو رہ گئے وہ سب کے سب مع ہمت حسین کے والد صاحب کے مل کر اب ہمیں مار ڈالیں، کسی غپ شپ کی اجازت نہیں۔ تاش میں الگ گڑبڑ جب دیکھو چلے آ رہے ہیں بڑے میاں مصطفےٰ کمال پاشا کا ذکر لئے۔ اگر یونہی دو چار اور سورما مع اپنے مداحوں کے اسلام نے اور پیدا کر دئے تو چلئے چھٹی ہوئی کم از کم ہماری خوشیاں اور دلچسپیاں تو لد گئیں پتّے پار۔

میں نے کہا "نام تو صاحب تیغ علی بھی خوب رہیگا"۔

ہمت حسین کے والد صاحب نے یہ نام سُن کر بھنویں سُکیڑ لیں۔ کہنے لگے لغوی نقطۂ نظر سے نام تو اچھا ہے مگر ویسے ٹھیک نہیں ہے اور پھر وہی مصطفےٰ کمال پاشا کا ذکر۔ ہمیں دراصل نام سے زیادہ بحث تھی بھی نہیں۔

جب اس بچّہ کا خیال آتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ چلو بھئی محنت ٹھکانے تو لگی۔ کیسے کیسے ہم بھی شادی کے موقع پر حیران ہوئے ہیں تب کہیں جا کر دُلہن ہاتھ آئی۔ پھر اُس کے بعد بڑی مشکل سے جا کر کہیں یہ لڑکا ہاتھ آیا ہے!

مگر غرض ہے کہ ہماری تمام خوشیاں دم بخود ہو گئیں۔ خود ہم ہی جو دم بخود

رہ گئے۔ ارے میاں کس تمنا سے تو بھتیجے کو دیکھتے ہیں اور وہ ایسا کہ ہم کیا کہیں اب۔ اور لطف یہ کہ نام مصطفٰے کمال رکھدیا۔ رکھا تو انور پاشا جاتا مگر وہ مر چکے تھے۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ یا تو پھر ہم نے اور لڑکے غور سے نہیں دیکھے اور یا پھر یہ لڑکا تھا ہی بہت واہیات۔ ناک تو ندارد ہی سمجھئے اور جو کچھ تھی بھی وہ پھولے ہوئے گالوں میں غائب یا روپوش ایسی کہ یا تو کئی ناکیں گن لو ورنہ اس قصہ ہی کو ہمت چھوڑدو۔ رنگ بھی سیاہ تاب۔ منہ عجیب واہیات۔ ماتھا ندارد بھویں بھی غائب۔ گو سُرمہ سے بنادی گئی تھیں۔ پر سُرمہ غریب کی کیا چل سکے رنگت پر۔ غرض ہمیں یہ بچہ بہت ناپسند ہوا اور ہم نے ہمت حسین سے کہدیا کہ "ابے اُلّو یہ تو بہت بُرا ہے"۔

اب ہم یہ سوچے کہ بھئی ہمت حسین خود تو ایسا ہے نہیں۔ یہ معاملہ کیا ہے رہ گئی ہمت حسین کی بیوی۔ تو یہ امر تو کب کا طے ہو چکا تھا کہ وہ بہت خوبصورت ہیں۔ یا پھر ہمت حسین جھوٹ بولتا ہوگا۔ اب ہمت حسین سے جو پوچھتے ہیں تو آپ فرماتے ہیں کہ "لڑکا دراصل اپنی ننھیال والوں پر گیا ہے"۔ "ابے واہ بے تیری ننھیال۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ مگر نہیں میں نے یہ سُن کر کہا: بیہودے شادی میں تو ہم بھی تیرے ساتھ ہی تھے۔ کوئی اندھے تو گئے نہیں تھے۔ ہو نہ ہو یہ ساری خطا تیری بیوی کی ہے۔ ہم سے چھپاتا ہے"۔ اور پھر خیال ہوا کہ اور جو ایسا نہیں ہے تو ایک سرے سے شادی کا معاملہ ہی خطرناک

ہُوا جاتا ہے۔ بھئی ایسے بچے جو ہوئے تو؟ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے!

غرض آپ کچھ ہی کہیں ہمارا جوش کافور سا ہو گیا۔ مگر مزہ تو دیکھئے ہمت حسین کی بیوی نے اپنی پوزیشن یوں صاف کی کہ اپنی ملنے والیوں سے کہدیا کہ بچہ اپنی دادھیال والوں پر گیا ہے۔ چنانچہ کسی دوسری جگہ بھابی جان کو بھی ملی تھیں تب بھابی جان نے مجھ سے ہمت حسین کی صورت شکل کو پوچھا اور بتایا کہ ہمت حسین کی بیوی کیا کہتی ہیں۔

تب جا کر ہمیں معلوم ہوا کہ خطا در اصل خود اس احمق ہمت حسین اور اُس کی بیوی کی ہے جو ایسا لڑکا ہوا اور دونوں اس بدعت کے مشترکہ ذمہ دار ہیں۔ ورنہ ننھیال اور دادھیال میں تو کوئی بھی بھوت" پریت" یا "ودبلاؤ" ٹائپ نہیں تھا۔ ذرا دیکھئے تو کہ لوگ کس طرح اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوشی حاصل کرتے ہیں۔ اب طرّہ اس پر یہ کہ نام اُن کا مصطفٰے کمال تھا۔ درحالیکہ کوہ قاف کا ایک حصہ اب بھی ترکی سلطنت میں ہے۔ اور وہاں اب بھی بغاوت نہیں ہوئی۔

مگر آپ کو ہم مطمئن کئے دیتے ہیں کہ ان مصطفٰے کمال کی وجہ سے ابتک ہماری اور ہمت حسین کی دوستی میں ذرہ بھر فرق نہ پڑا تھا۔ اور کیوں پڑتا کوئی ہماری ہستی تو معرضِ خطر میں اُن کی وجہ سے آئی نہیں تھی۔ یہ اور بات ہے کہ جب یہ ذرا بڑے ہوئے اور کچھ اور بھی "بھنگم" ہو گئے تو اس پر ستم یہ کیا کہ اپنے احمق باپ سے تھوڑا سا نہیں بلکہ "بافراط" ہل گئے تب البتہ

حیران کرنے لگے۔ غور فرمائیے کہ ہم تو کھیل رہے ہیں تاش اور یہ جو رد تے ہیں تو معلوم ہوا کہ ٹرکش گورنمنٹ نے یونان کے خلاف جہاد بول دیا۔ کہاں یونان کہاں ہم غریب؟

—— ۵ ——

اب یہ مصطفٰے کمال کوئی برس ڈیڑھ ایک کے ہونگے کہ ایک عجیب ہی معاملہ پیش آیا۔ دراصل ہمارے ایک اور دوست کی شادی ہوئی۔ اُس میں کہیں باہر آنا جانا نہ تھا۔ اور اس شادی میں ہم بڑے زور شور سے حصہ لینے کو تھے، جس کی اہمیت اور عظمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بھابی جان تک کو ہم نے راضی کر لیا تھا کہ وہ اس میں شرکت کریں۔ اور انہوں نے یہ شرط لگائی تھی کہ میں اُن کو برابر یاد دلاتا رہوں کہ اب جانے میں کتنے دن ہیں ورنہ اسی دوران میں اگر انہوں نے کسی اور سے وعدہ بھول کر کر لیا تو وہ ذمہ دار نہیں۔

اور جب میں وقتاً فوقتاً یاد دلاتا رہا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھابی جان نے ایک روز بگڑ کر کہا "چولھے میں جائیں تمہارے ہمت حسین اور بھاڑ میں جلے اُن کی شادی . . . . . . دن ہے تو اور رات ہے تو ایک رٹ لگ گئی —— (اُنگلی گھما کر) شادی۔ شادی۔ شادی۔"

اب ذرا غور فرمائیے ان بھابی جان کی زیادتی پر کہ ہمت حسین کی شادی

کو کہتی ہیں۔ میں نے اعتراض کیا تو جل کر کہتی ہیں: "وہ ہمت حسین ہوں یا قلندر حسین"
میں چُپ ہو رہا۔

—— : ۶ : ——

جب شادی کا دن آیا تو اوّل تو بھابی جان نے نخواہ مخواہ اُس دن مجھ
سے ایسے کام لئے۔ جن کا آنے جانے سے کسی قسم کا بھی تعلق نہ تھا۔ ویسے
تو میں کب کرتا مگر کرنے پڑے۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ پھر شرط ایک اور لگائی
وہ یہ کہ وہاں سے واپس پیدل آئینگی۔ اور اگر میاں موہن سلمہٗ کا نوکر شادی
سے اپنے گھر چلا گیا تو کیا ہوگا۔

میں نے کہا "پیدل کیوں آؤ گی۔ ہم تانگہ لا دینگے"
مگر جناب اُنہوں نے انکار کر دیا۔ دراصل اپنی کسی سہیلی کو ساتھ لے کر
راستہ میں باغ ہے اُس میں جھولے وغیرہ لٹکے ہیں۔ کھسکنے کا پلیٹ فارم
ہے۔ اُس پر چڑھ گئیں اور وہاں سے دو تین بیٹھ کر ڈھال پر سے کھسکتی چلی
آ رہی ہیں۔ تو مطلب یہ تھا کہ وہاں ہوتی ہوئی آئینگی۔ مگر سوال یہ ہے کہ نوکر کو
پھر کیوں چھٹی دو۔ کہنے لگیں کہ میں چھٹی تو نہیں دونگی مگر نوکر خود بچہ ٹھیرا۔ نیند
آ گئی اُسے۔ یا بھاگ گیا وہ رات کو گھر۔ یا پھر صبح تڑکے واپس نہ آ سکا۔
میں دیر تک سوچتا رہا۔ یہ تو عدّت ہے پوری۔ یہ اپنی سہیلیوں کے
ساتھ دراصل باغ کے جھولوں میں کھیلنے جا رہی ہیں اور احسان دھرتی ہیں

مجھ پر۔ مگر پھر سوچا کہ بات ہی کونسی ہے۔ نوکر کو ہم دو آنہ پیسے دیکر روک لینگے جاتا بھی ہوگا تو نہ جائیگا۔ مگر یہ مجھے معلوم نہ تھا کہ نہیں جاتا ہوگا تب بھی جائیگا۔

—————— ۷ ——————

میری جانِ حزیں پر بھابی جان نے بڑا کرم کیا جو شرکت کی ہمت حسین اپنی بیوی کو لیکر ہمارے یہاں آگئے تاکہ بھابی جان بھی اُسی تانگہ میں بیٹھ لیں۔ اس تانگہ میں مصطفےٰ کمال بھی تھے۔ بھابی جان نے جو سُنا تو بگڑ گئیں، کہنے لگیں: "بھیّا ہم اس جھگڑے میں نہیں پڑتے۔ اُن کا بچّہ روئے پیٹیگا مچلیگا اور تموہن سے لڑیگا...... اور تموہن نے اُسے مارا تو؟......"

میں نے کہا: "موہن کو ڈانٹ دینا تم......"

وہ بولیں: "مجھے کیا غرض جو میں اپنے بچّہ کو کسی کے پیچھے ڈانٹتی پھروں"

قصّہ مختصر یہ طے ہُوا کہ موہن مصطفیٰ کمال کو قتل کردیں تو بھی کچھ مزاحمت نہ ہوگی، بڑی مشکل سے بھابی جان راضی ہوئیں۔ ذرا غور تو کیجئے کہ انکار کرتی تھیں ایسے کہ میں وجہ انکار بھی نہ بتا سکوں۔

میں نے جل کر کہا: "بھابی جان تمہیں اس معصوم بچہ (مصطفیٰ کمال) سے ضد سی ہے"

کہنے لگیں: "ہاں ضد ہے مجھے۔ پھر......"

میں چُپ ہو رہا۔

۸

شادی کا کھانا ختم ہوتے ہی بھابی جان نے غل مچا دیا کہ میں جاتی ہوں بمشکل میں نے گھنٹہ بھر کا کہہ کر روکا۔

اب ظلم تو دیکھئے کہ بھابی جان کے نوکر کو میں نے دو آنہ دیدیئے کہ گھر مت جانا۔ بھابی جان نے نہ صرف اُسے بھیجدیا چپکے سے بلکہ خود بھی بغیر اطلاع کئے باغ میں پہنچیں اور وہاں سے عین بیخبری میں اُن کی سہیلی کا نوکر مجھے ایک رُقعہ پہنچاتا ہے کہ میں میاں موہن کو لیکر فوراً باغ میں چلا آؤں۔

اب میں موہن کے خادم کو دیکھتا ہوں تو ندارد۔ شادی کی ریل پیل اور بھیڑ بھاڑ۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے بدحواس ہوگیا مگر نہ ملا۔ بڑی مشکل سے ایک بُڑھیا نے بتایا کہ اپنے آقا کو اندر ایک کھٹولے پر سُلا کر اپنے گھر گیا اُس کو تاکید سے بھابی جان نے بھیجدیا۔ سوال یہ تھا کہ اب میں کیا کروں

میں نے ان بڑی بی سے کہا کہ میرے اوپر بڑا کرم ہوگا جو اندر سے میرے بھتیجے کو لاکر مجھے دیدو۔ مگر شرط یہ کہ میں باہر دروازہ سے ذرا دُور لونگا تاکہ کوئی یہ نہ دیکھے کہ بچہ کھلائے سوٹ بوٹ پہنے چلے جارہے ہیں دراصل باغ بالکل ہی قریب تھا۔

بڑی بی بمشکل راضی ہوئیں۔ وہ بھی پیسے لیکر۔ میں تو اُن کو اور بھی پیسے دیتا تھا کہ باغ تک چلی چلو مگر اُن کو فرصت کہاں۔

سردی کا زمانہ تھا۔ بچہ کو انہوں نے احتیاط سے دُلائی میں لپیٹ کر مکان کے باہر میرے حوالہ کیا۔ میں نے ایسے سنبھال کر لیا کہ جاگ نہ اُٹھے جو مجھے وہیں کا وہیں قتل کردے۔ کیونکہ میں جانتا ہی تھا کہ موہن ایک قاتل ٹھیرا۔ ہل بھی گیا تو جیتا نہ چھوڑیگا لہٰذا میں نے شیشے کی طرح رضائی میں لپیٹ کر اُسے کندھے سے لگا لیا۔

اب میں بڑی احتیاط سے کہ موہن جاگ نہ اُٹھیں اُنہیں کندھے سے لگائے ڈگ بڑھائے باغ میں پہنچا۔ سامنے کیا دیکھتا ہوں کہ بھابی جان اپنی سہیلیوں کے ساتھ جھولوں پر دھما چوکڑی میں لگی ہیں، جیسے ہی میں پہنچا تو بگڑ کر بولیں:۔

"اِدھر کہاں گھسے پڑتے ہو۔ پردہ ہے"

یہ اِس لئے کہ بچہ نہ لینا پڑے۔

اب میں اجازت چاہتا ہوں کہ موہن کو بینچ پر لٹا دوں تو جواب ملتا ہے نہیں سردی لگ جائیگی۔ چمٹائے رہو۔ اور تاکید یہ کہ "جگانا مت" وہ موہن ہوں خواہ کوئی اور۔ جاگ کر گویا مجھے کوئی تمغہ ہی تو دیدینگے۔

:۹:

اب جناب چند ہی منٹ میں میرا ہاتھ بھی دُکھ گیا اور بچہ کچھ گُنگُنا یا بھی اور میں نے تقاضا کیا کہ جلدی چلو اور خود کندھا ہلا کر میں گُنگُنا کر تھپکا۔

بڑی مشکل سے بھابی جان بڑبڑاتی ہوئی ساتھ ہوئیں۔ میں نے بچّہ کو اُنہیں دیا۔ اُنہوں نے کندھے سے لگایا۔ اور ہم دونوں ابھی روانہ بھی نہ ہوئے تھے کہ بچّہ اور چینچنایا۔ بھابی جان نے کلیجہ سے لگا کر کہا "میرا بچّہ" اور لوری دے کر پھر کندھے پر۔ مگر وہ پھر ٹھنکا تو بھابی جان نے پھر لوری دی۔ چمکارا "میرا بچّہ...... میرا چاند...... میرا کلیجہ...... میری جان......"

اور اِدھر بھابی جان نے کہا ہے "میری جا.... آ۔ ن" اور اِدھر جناب ٹیں...... ایں۔ ں۔ ں...." اور ٹانگیں پھیلا کر بچّے نے کہا "چیّرڑ ه...... ر...." اور پھر جو مچلا ہے ٹانگیں سیدھی کر کے تو بدحواس ہو کر بھابی جان کے مُنہ سے ایک چیخ نکلی "قیں...... ن.... ڈِ غ!" بچّہ چھوٹ کر نیچے۔ میں بچّہ کو اُٹھانے دوڑا۔ آپ یقین کریں کہ مُوہن نہیں۔ یہ تو مصطفیٰ کمال تھے! اور اُنہوں نے بول دیا جہاد۔!

بھابی جان نے سر پیٹ لیا۔ ہائے میرا بچّہ بدل گیا اور گرج کر لگیں برسنے میرے اوپر۔ خدا کی پناہ! اور اِدھر مصطفےٰ کمال بکھرے ہوئے میرے ہوش زائل ہو گئے۔

بس آپ سے عرض کر دوں۔ غدر آ گیا۔ ایسا کہ تار چھاندر ہی تھیں باغ کا جو سہیلیوں نے بھابی جان کی چیخیں سُنیں تو لوٹ پڑیں۔ دراصل

بچّہ بدل گیا۔ اور اب مصطفےٰ کمال ہے کہ رو دیا جو ہے ہیر اسٹیر تو آپ سے کیا عرض کروں۔ لپیٹ لپاٹ کے رضائی میں دوڑائیں اُسے ہلاتا اور جھکولتا ہُوا۔ کہ راضی ہو کر چُپ ہو جائے۔ مگر توبہ کیجئے۔ گود میں سے ہے کہ نکلا پڑتا ہے پھسلا جا رہا ہے، ٹانگوں میں معلوم ہو کسی نے انجن لگا دیا کہ چلا جا رہا ہے پہنچتے پہنچتے اُس نے میرے حواس کھو دئے اور دروازہ پر پہنچا ہوں کہ اُس نے مجھے تر کر دیا۔ مجھے اب دونوں ہاتھوں میں اُسے لٹکانا پڑا۔ اب سین ملاحظہ ہو۔ ہوا میں حضرت معلّق۔ رضائی لٹک رہی ہے اُلٹی سیدھی اور یہ ہاتھ پیر چلا کر رو نہیں رہے بلکہ یہ سمجھئے کہ میں جو گھسا ہوں تو گویا موٹر گھس پڑا بھیڑ میں ہارن دیتا ہُوا۔ گیس کی تیز روشنی۔ سیدھا میں پنڈال میں آیا۔ جان سلگ رہی اُسی طرح ہاتھوں میں بلند کئے۔ لوگوں نے گردنیں لمبی کر کر کے دیکھا کہ دردانیال کی جنگ کا نقشہ پیش ہے۔ ہمّت حسین جو نظر پڑے۔ بیساختہ میرے مُنہ سے نکلا "لو جی اپنے لیچڑ کو!"

اب یہاں یہ بحث نہیں کہ لفظ "لیچڑ" میں موسیقیت کتنی مضمر ہے یا پھر یہ کہ بہ نسبت موسیقیت کے اس لفظ میں دراصل ترنم کُوٹ کُوٹ کر زیادہ بھر دیا ہے۔ ہمیں تو یہاں اس لفظ کے لغوی معنی سے بحث ہے کسی لغت کا حوالہ دینا مشکل ہے قسم کیجئے تو کھالی جائے کہ ہمارے یہاں ایک گھوسی تھا۔ ایک روز کہنے لگا کہ صاحب "لیچڑ" کی طبیعت خراب ہے۔

اتفاقاً ہمت حسین بھی وہیں تھے۔ ہم نے پوچھا کہ بھئی لیچرڈ کون۔ دراصل ہم یہ سمجھے کہ اُس کا کوئی رشتہ دار ہوگا۔ تب معلوم ہُوا کہ بھینس کا بچہ بہت بیمار ہے اور بھینس کا بچہ نہیں بلکہ صحیح لفظ تو "لیچڑ" ہے۔

اس وقت اس لفظ کو سُن کر لوگوں نے قہقہہ لگایا۔ یاروں نے پھبتیاں کسیں۔ اس سلسلہ میں ابّا اور امّاں کے الفاظ کی امداد سے مُرکب جُملے بنائے گئے۔ یہ تو خیر کچھ نہیں مگر ٹھیس کا اصل پہلو اور ہی تھا مختلف سائز کے بچّے بھی اس محفل میں تھے۔ اُن میں سے کچھ بیچارے یہ سمجھے کہ بچّے کا نام ہی لیچڑ ہے۔ اب غلطی میری کہئیے یا ہمت حسین کی انہی دو ایک بچّوں سے یہ خدمت لینا رہ گئی تھی کہ بچّہ کی ماں کو بُلا دیں۔

قصّہ مختصر مجھے علم نہیں وہاں اندر کیا ہُوا اور کون گیا۔ ہمت حسین روتے ہُوئے بچّے کو لے کر دروازہ پر پہنچے۔ اُنھوں نے اندر کیا کہلوایا اور کس کی زبانی۔ اس کی تحقیقات فضول ہے۔ بچّوں نے اندر جاکر کہا بچّوں سے ایک سخت احمق بڑھیا نے سُن لیا۔ بچّے کچھ سمجھا نہ سکے۔ بڑھیا نے معاملہ یوں صاف کیا کہ سمجھی بچّہ کا پیار کا نام، لہٰذا اُس نے کہا کہ "لیچڑ میاں" رو رہے ہیں دروازہ پر اور دراصل اُن کی والدہ ماجدہ درکار ہیں۔ جس نے بھی سُنا اُسے ہنسی آئی۔ بڑھیا بیچاری بھونچکی کھڑی۔ خود ہمت حسین کی بیوی خوب ہنسیں مگر یہ ہنسی ناپائدار ثابت ہُوئی کیونکہ فوراً ہی معلوم ہُوا کہ خیر

سے "پیچڑلی اماں"۔ خود ہیں۔ ساتھ والیاں مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ گئیں کسی کی سمجھ میں اس وقت نہ آیا کہ یہ "پیچڑ" نام کیسے اور کس نے رکھ دیا اور یہ کیونکر اس وقت اس بدتمیزی سے مشہور ہو گیا۔ ہنسی مذاق ہی سہی۔ لینے کو تو جا کر بچہ لے آئیں مگر دہر کے اُسے دہیں کا وہیں پیٹ دیا اچھی طرح۔ مگر توبہ کیجئے۔ ساتھ والیاں ایک شریر۔ ہمت حسین کی بیوی کا نام "پیچڑ کی ماں" رکھ دیا گیا۔

اب ذرا ٹھیس کی نزاکت پر غور کیجئے۔ خطا میری ہی ٹھیری۔ پھر خدا بھلا کرے خود ہمت حسین کا۔ بدتمیز ہنستا ہے اس نام پر۔ نہ صرف یہ بلکہ اُس احمق نے گھر پہنچ کر گھر والی کو مذاق میں پکارا "پیچڑ کی اماں" اس کا جو کچھ نتیجہ ہوا وہ برطرف۔ پھر بعد میں بچے نے جو پریشان کیا کبھی تو جل کر یہی کہہ دیا "ہٹاؤ اسے اپنے پیچڑ کو۔۔۔۔۔ روئے جاتا ہے۔۔۔۔۔"

اب ظاہر ہے کہ آئی گئی میرے سر۔ وہ لگیں چڑھنے۔ میاں بیوی میں حجت اور بحث ہوئی۔ پھر لڑائی تک نوبت پہنچی۔ میرے نام سے نفرت ہو گئی اور ضد یہ کہ مجھ سے ملنا جلنا ترک کر دو۔

نتیجہ ظاہر ہے۔ اب لاکھ میں معافی مانگتا ہوں۔ اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہوں۔ مگر سچ کہا ہے شاعر نے۔ ٹھیس لگے پیچھے آبگینہ سلامت

رہ جائے تو نہ وہ آبگینہ۔ پھر تو ہتھوڑا اور نہائی ہو گیا۔

دوستی کا جہاں تک سوال ہے قائم ہے۔ مگر آبگینہ نہیں جُڑ سکتا وہ دن اور آج کا دن۔ شعر کو پڑھتا ہوں اور اُس کی تکلیف دہ تشریح پر غور کرتا ہوں۔ شعر کا ایک ایک لفظ ہے کہ دل میں گھُسا جاتا ہے اور جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے۔ ہر لفظ کی فصاحتوں اور بلاغتوں کا صحیح تر اندازہ ہوتا جاتا ہے۔

باپ

میں نے امّاں سے پوچھا "امّاں سب کے ابّا ہیں۔ ہمارے ابّا کیا ہوئے؟" امّاں نے اس کے جواب میں نانی امّاں کی طرف دیکھا۔ نانی امّاں نے کہا "نوکروں کے ابّا ہوتے ہیں۔ دیکھو نا بدھو کا ابّا ہے۔ سکینہ کا ابّا ہے۔ بی بیوں کے ابّا نہیں ہوتے"

اس کے بہت عرصہ بعد ایک معزز بی بی ملنے آئیں تو مجھے ایک نئی بات کا پتہ چلا۔ وہ یہ کہ اُن کی پیاری پیاری بچّی کے بھی ابّا تھے۔ چنانچہ میں نے اُن کی بچّی کو کہا "لونڈی۔ لونڈی۔ نوکرانی۔ نوکرانی" وہ رونے مچلنے لگی تو امّاں جان نے کہا "نا بیٹی یہ تمہاری بہن ہے تم اسے مت رلاؤ۔ میں نے جواب دیا "امّاں جان یہ نوکرانی ہے۔ اس کے تو ابّا ہیں۔ آپ ہی نے تو اس روز کہا تھا کہ ابّا نوکرانیوں کے ہوتے ہیں"

میری یہ مدلّل بات سُن کر بجائے اس کے کہ مجھے کوئی سُلجھا ہُوا جواب ملتا۔ سب ایک دم سے ہنسنے لگے۔ پھر کسی نے مجھے چمکار اکسی

نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ نانی جان نے اُٹھا کر گود میں بٹھا لیا۔ میں نے پھر جو ابا کو پوچھا تو والدہ صاحبہ نے جل کر کہا "مر گئے ابا تیرے" نانی صاحبہ نے کہا "ابا بڑے"

اپنے ابا کے وجود کا میرے معصوم دل میں شاید یہ پہلی دفعہ احساس ہوا۔ لیکن اس سے زائد کچھ بھی نہیں۔ پھر بھی کئی دفعہ میں نے پوچھا۔ اپنے چھوٹے سے ذہن اور بچوں کی عقل کے مطابق کبھی کبھار ضرور ابا کی ہستی کی ضرورت محسوس کی۔ کبھی کسی سے سُنا کہ اس کے ابا نے مٹھائی لادی۔ کھلونا لادیا۔ کوئی اور چیز لادی۔ تو چیز کے ساتھ ہی ساتھ دینے والے کی ذات کا تخیل ضرور سامنے آیا۔ میرے لئے ابا کا تخیل ایک مہربان کا سا تھا۔ جس کی مہربانی کی داستانیں ہم عمروں سے سُننے میں آتی تھیں اور یرے معصوم دل میں ایک چھوٹی سی لہر اُٹھتی تھی کہ میرے "ابا" بھی ہوتے تو اچھا تھا مگر نہیں ہیں! بڑے ہیں! .... بڑے نے! بچپنے کی عقل کی دوڑ بس یہیں تک تھی۔ آگے کبھی غور ہی اوّل تو نہیں کیا اور بالفرض کیا بھی تو دماغ نے اس سے آگے کچھ کام نہ کیا کہ ایک واہمہ کے ساتھ مٹھائیاں کھلونے وغیرہ بہت سے نظر آئے۔ .... وہ بچے ایک دم سے پیش نظر ہو گئے جن کے ابا تھے۔ بدھو کے ابا یعنی خانساماں کی ڈراونی شکل سامنے آ گئی۔ سکینہ کے ابا کی لمبی سی ڈاڑھی ہوا میں اُڑتی

نظر پڑی۔ آگے جا کر ذہن بھٹک کر رہ گیا اور بس۔ ابّا کے تخیّل کی یہی انتہا تھی۔

۲

لیکن عمر کی ترقّی کے ساتھ ساتھ عقل اور سمجھ نے ترقّی کی واقعات پر سے از خود نقاب اُٹھنے لگا۔ گھر ہی کی باتوں نے سب کچھ بتا دیا۔ جتنی میری امّاں جان کی جائداد تھی اُس کی آدھی کے قریب ابّا کی بھی جائداد تھی۔ بڑی دھوم سے اُن کی شادی والدہ صاحبہ کے ساتھ ہوئی تھی۔ وہ شرابی اور کبابی اور بدقماش نکل گئے۔ اپنی ساری جائداد کوکین اور دوسری لغویات کی نذر کر دی۔ والدہ صاحبہ کی جائداد کے چار گاؤں فروخت کر کے اُڑا دئے۔ والدہ صاحبہ کو بہت دق کرتے تھے۔ بات بڑھ گئی۔ ماموں ابّا سے اُن کی خوب لڑائی ہوئی۔ مقدمے چلے اُنھوں نے امّاں جان کو حیران کر مارا میں ڈیڑھ سال کی تھی۔ مجھے امّاں جان سے چھین لیا۔ ماموں ابّا سے مقدمے چلے۔ بڑی زبردست فوجداری ہوئی۔ دونوں طرف سے بندوقیں چلیں۔ ماموں ابّا کا ایک سپاہی مارا گیا۔ مقدمہ چلا اور ماموں ابّا نے ابّا کو قید کرا دی اور ابّا کے ایک سپاہی کو پھانسی دلوا دی۔ ابّا کے کیرکٹر میں دو باتیں بہت نمایاں تھیں۔ ایک تو اُن کی سخت بدمعاشی اور دُوسرے مجھ سے محبت کرنا۔ مجھ سے انھیں بڑی محبت تھی۔ ان کا نام آتے ہی امّاں جان اور والدہ صاحبہ کے مُنہ سے لعنت کے الفاظ نکلتے تھے۔ میں اُن کے

سب قصوں کو سنتی تھی اور غور کرتی تھی۔ اُن کے مظالم پر غور کرتی تو ایک پھریری سی آتی لیکن فوراً خیال ہوتا کہ مجھ سے اُنہیں بہت محبت تھی۔ ایک دم سے دل میں کوئی چیز انگڑائی لیتی معلوم ہوتی۔ ایک ناقابل بیان کشش سی اسی جابر باپ کی طرف دل کو کھینچتی لیکن میں فوراً اُن کے مظالم کا خیال کرتی جو والدہ صاحبہ پر اُنہوں نے کئے تھے اور اُن کو دل میں بُرا کہنے کی کوشش کرتی۔ ایک کشمکش خیالات میں پیدا ہوتی۔ میں ٹھٹک کر رہ جاتی۔ دل کہتا کہ اچھا اس جھگڑے کو جانے دو۔ مگر میں ایک دفعہ اپنے باپ کو دیکھوں تو کسی طرح۔

۔۔۔۔۔۔ ۳ ۔۔۔۔۔۔

زمانہ گزرا اور گزرتا گیا۔ بچپن گیا اور جوانی آئی۔ کوئی نئی بات نہ تھی کہ ایک دم سے گھر میں گویا ایک کھلبلی مچ گئی۔ معلوم ہوا کہ ابا جان جیل بھگت کر چھوٹ گئے۔ طرح طرح کی باتیں اور خبریں سُننے میں آئیں۔ ان خبروں میں دو باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ بوجہ مُفلسی کے وہ ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ مقدمہ لڑ کر مجھے لینا چاہتے ہیں۔ یا میرے اللہ! میں یہ خبر سُن کر ایک کونہ میں مُنہ دے کر روئی جب ماموں ابا نے والدہ صاحبہ سے کہا "بدمعاش کہیں کا۔ نہ سر پہ ٹوپی نہ پیر میں جوتا۔ کھانے کو ٹکڑا تو جُڑتا نہیں۔ میاں لڑکی لینے کے لئے مقدمہ بازی کرینگے"!

یہ سُنتے ہی میرا عجیب حال ہو گیا۔ ایکا ایکی دل بھر آیا۔ طبیعت اُمنڈ آئی جی گھبرا گیا۔ آنکھیں ڈُبڈبا آئیں۔ بہتیرا میں نے ضبط کیا پر نہ ہُوا۔ گھبرا کر تیزی سے اپنے کمرہ میں پہنچی۔ پہنچنا دُوبھر ہو گیا۔ آنسو جو زبردستی کے ظلم وستم سے ضبط کئے تھے ایک دم سے نکل پڑے۔ آہ! میری کیا حالت ہو گئی۔ کونہ میں مُنہ دے کر میں نے خوب دل کی بھڑاس نکالی۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی پر رونا بند نہ ہُوا۔ ایک سیلاب تھا کہ اُمڈا چلا آتا تھا۔ دل کٹا جاتا تھا۔ بس یہ خیال مارے ڈالتا تھا کہ میرے باپ کے پاس کھانے کو نہیں۔ پہننے کو نہیں۔ خدا کی پناہ وہ ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ خدا نے مجھے ریشم پہننے کو دیا اور بہترین کھانے کو لیکن میرے غریب باپ کا کیا حال ہے یہ مُفلسی اور مقدمہ لڑیں گے! کیوں؟ محض میرے لئے! میرے لینے کے لئے! میرا وہ کیا کرینگے! کیوں مجھے لینا چاہتے ہیں۔ خود کھانے کو نہیں مجھے کہاں سے کھلائیں گے؟ کہاں سے پہنائیں گے؟ گھر نہیں۔ در نہیں۔ مجھے کہاں رکھیں گے؟ یہ سوالات تھے جو میرے دماغ میں چکّر کھا کر برابر گھومنے لگے۔ مجبوری و لاچاری! لیکن نہیں۔ ایک سنسنی سی بدن میں دَوڑتی معلوم ہُوئی طبیعت میں ہیجان سا برپا ہُوا۔ خیالات کی رَو میں ایک جھٹکا سا لگا......... کیا میں بھوکی رہ سکتی ہوں؟ پھٹے سے پھٹا کپڑا پہن سکتی ہوں؟ ضرور اور بالضرور۔ میرا دل اپنے باپ! نادیدہ باپ کی محبت سے پھٹا جا رہا تھا......... میں پھر بے قابو

ہو گئی ۔۔۔۔۔ یا میرے اللہ کوئی اتنا کرے کہ میری چوڑیاں کوئی اُنہیں دے آئے۔ کیوں ؟ اس لئے کہ وہ بیچ کر روپیہ کر کے میرے لینے کے لئے مقدمہ لڑیں!

اس دن میں نے کھانا نہیں کھایا۔ والدہ صاحبہ اور نانی صاحبہ دونوں نے مجھے بار بار غور سے دیکھا۔ نانی صاحبہ نے دو تین دفعہ اُداسی کی وجہ پوچھی۔ میں نے دردِ سر کا عذر کیا۔ بات آئی گئی ہوئی لیکن مجھے ایک غم سا لگ گیا۔ جب کھانا سامنے آتا۔ نوالہ لیتی بس دل بھر آتا کہ میرے باپ کا کیا حال ہو گا اچھے کپڑے کو دیکھتی۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے دل اُمنڈ آتا۔ گھبرا کر کپڑے کی طرف سے مُنہ موڑ لیتی۔

۴

ایک روز کا ذکر ہے کہ صبح کے کوئی دس بجے ہونگے۔ چھت پر کمرہ کی کھڑکی سے میں نیچے باغ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کیا ہی دلچسپ منظر تھا سبزہ لہلہا رہا تھا۔ خوش گوار ہوا سے درخت جھوم رہے تھے۔ چڑیاں درختوں پر چہک رہی تھیں۔ میں اس خوش نما منظر میں محو ہی تھی کہ میری نظر احاطہ کی دیوار پر پڑی۔ دیوار کے اس طرف کوئی آدمی کھڑا تھا۔ کوئی چالیس برس کی عمر ہو گی ایک اُجڑا سا میلا کوٹ پہنے جسے سفید کہنا جُرم تھا۔ ایک نہایت ہی گندی اور میلی طوفان زدہ ترکی ٹوپی جس کے کنارے کا میل اتنی دور سے صاف